

ملاپانی

www.KitaboSunnat.com



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload)

کی جاتی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

حکام

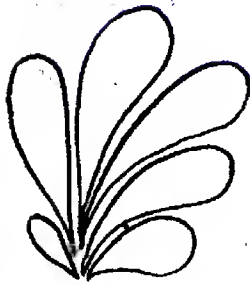
محکم دلائل سے مزین متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

طائف اکبر می
سورٹ ۲
فیصل آباد

ترتیب ہدیت محمد سرور طارق

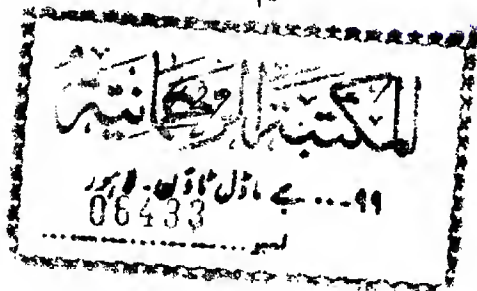
www.KitaboSunnat.com

شہنشاہ اکبر می جامعہ تسلیم الاسلام - ماسوں کابجھ



ناشر ————— طارق الکیڈمی فیصل آباد
 طباعت ————— اسرڈ آفٹ پریس فیصل آباد
 کتابت ————— احسان الحق
 تزئین ————— ابن نسیم
 تاریخ اشاعت ————— نومبر ۱۹۷۷ء
 قیمت: ————— { مجلد ۹ روپے
 پیپر بیک ۸ روپے }

تقسیم کنندگان: —————



اَلْاَمَامِ
 اَلْمَوَدَّیْنِ

چنیوٹ بازار فیصل آباد

فہرست

۶۷	سزا کا فیصلہ	۶۰	مقدمہ از حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی
۶۹	چیف کورٹ میں اپیل	۶۱	سزا کے نتیجے میں۔ از محمد خالد سیف
۷۱	قانونی میاں جان کا انتقال	۶۲	پیش لفظ
"	آہ! والدہ مرحومہ	۶۵	مکرر امیلا
۷۴	جیل کی مشقت	"	سازش کا انکشاف
۷۷	صاف صاف باتیں	۶۸	سزا
۷۸	مولانا احمد اللہ کی گرفتاری	۷۱	ہلی گڑھ میں گرفتاری
۸۰	اہل و عیال کی طرف روانگی	"	جیل میں ناقص خود رک
۸۲	سینٹرل جیل لاہور	۷۲	استحسانِ عشق
۸۳	ایک قیدی کا اعلیٰ کردار	۷۳	دہلی سے انبالہ تک
۸۴	کراچی کوروانگی	۷۶	قداروں پر فوازشیں
۸۴	ملتان میں	"	شیخ النکل میاں نذیر حسین کی طلبی
"	کراچی جیل میں	۷۰	ہمارے ہندوستانی مسلمان
۸۶	صبح سفر شام سفر	۷۱	مقدمہ انبالہ
۸۸	کالا پانی کوروانگی	"	پولیس تشدد کی ایک مثال
۹۰	مولانا احمد اللہ سے ملاقات	۷۲	بھائی کا جھوٹی گواہی سے انکار
۹۱	جزائرِ انڈمان	۷۲	مقدمہ سیشن سپرو
۹۲	پیداوار اور آب و ہوا	"	مولانا بھٹی علی کی صحبت
۹۴	انڈمان کی نوآبادی	۷۴	مقدمہ کی پیروی
"	اصلی باشندے	۷۵	مسٹر پلاؤٹون کے قانونی نکات

۱۲۰	مجاہدین اور سرکار ہند	۹۵	مذہبی خیالات
۱۲۱	پٹنہ اور بنگال میں گرفتاریاں	۹۶	سماجی زندگی
۱۲۳	ہنر کی کتاب	۹۹	جنگ آزادی کے قیدی
۱۲۶	مولانا احمد اٹھ کا انتقال	۱۰۱	شادی خانہ آبادی
۱۲۸	رباطی	"	سرفنا عبد الرحیم
۱۲۹	رواگی کے انتظامات	"	تین سنگ حادثے
۱۳۰	تعصب کی انتہا	۱۰۳	بیوی کا انتقال
"	انڈمان کا انتظام حکومت	۱۰۵	دوسری شادی
۱۳۱	قیدیوں کے لیے قوانین	۱۰۸	ایک جھوٹا مقدمہ
۱۳۲	مختلف اقوام اور ان کی معاشرت	۱۰۹	عید الاضحیٰ کے موقع پر جھگڑا
۱۳۵	الوداعی ضیافت	"	ہندوؤں کی سازشیں
۱۳۶	مولانا لیاقت علی آبادی	۱۱۲	مولانا محمد حسن انڈمان میں
۱۳۷	ہندوستان کو روٹنگی	۱۱۳	لارڈ میو انڈمان میں
۱۴۱	تھامیسر	"	لارڈ میو کا قتل
"	انعامات الہی	۱۱۵	شیر علی تختہ دار پر
۱۴۳	ریاست اور نول میں ملازمت	۱۱۶	ایشی پریشاد کی سازش
"	مکمل آزادی	"	انگریزی زبان کی تعلیم
۱۴۴	خاتمہ	۱۱۸	مغربی علوم کا محدث اثر

تقریب اشاعت

زیر نظر کتاب ”کالا پانی“ تحریک احیائے دین امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک
 امام محمد اسماعیل شہیدؒ کی ایک درخشندہ ترین جھلک ہے۔ اس کی اشاعت سے مقصد صرف یہ ہے کہ
 شاید اس کے مطالعہ سے مملکت خداداد پاکستان میں محمدی انقلاب برپا کرنے کے مقدس ترین
 فرض سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت کسی بھائی کو نصیب ہو جائے۔
 تاریک شب ہے جد اپنے قافلے سے ہے تو
 تیرے لیے ہے میرا شعلہ فراقتندیل
 دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے ہماری لغزشوں کو معاف فرماتے ہوئے ہیں
 اسی اس مقدس ترین نصب العین میں کامیابی و کامرانی سے سرفراز فرمائے۔
 ماسک روحاں بامید شہادت زندہ ایم
 در خیال ماحیات جاوداں گراں باشد
 حضرت سید عمر فاروق غزوئی زید مجدہؓ نے بھی جو اپنے مرحوم بھائی حضرت سید ابوبکر غزوئی رحمۃ
 علیہ کی طرح اپنے دل میں احیائے دین کی تڑپ رکھتے ہیں — کئی مرتبہ فرمایا کہ میری تمنا ہے
 ”کالا پانی“ کو شہید اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا جائے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور ہمارے
 دُعا و رُعبہ نجات بنادے۔

محمد سلیمان غنی عنہ بن امیر المجاہدین مولانا فضل الہی وزیر آبادیؒ

نامزد جانشین حضرت امیر المجاہدین عارف باللہؒ

صوفی محمد عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کابٹن

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين والصلوة على انبيائهم ميمم الخاتم لهم والسلام على

الاتباء البررة المكرمين الى يوم الدين -

پیش نظر کتاب مولانا محمد جعفر تھانیسری مغفور کی خود نوشت سرگزشت ہے —
اس کتاب میں متعدد مقامات پر دو بانی یا ابوحدیث کا تذکرہ ملے گا۔ ”دو بانی“ کا لفظ تو سرکار
انگریزی کا خود ساختہ ہے، اہل توحید نے ان شخصی نسبتوں کو اپنے لیے کبھی پسند نہیں کیا البتہ اہل
حدیث کے لفظ کو اپنے مسلک کے لحاظ سے منور پسند کیا گیا۔ اس وقت میں نہیں کہہ سکتا کہ جماعت
کی اس لفظ کے متعلق کیا پوزیشن ہے لیکن اصل وضع کے وقت یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ اس لقب کے
ساتھ نظر و فکر کے ان سکولوں میں احتساب مقصود تھا، جو جوہر و تقلیدی کے ترجمان تھے اور اس فرقہ پوری
کے سبب اسلام پر کسی حد بندیاں لگا دی گئی تھیں، جن کو عبور کرنا ترک اسلام کے مرادف یا کم از کم
فسق و معصیت سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ اسلام نے سب سے بڑی نعمت جو اپنے متبعین کو عطا فرمائی
تھی، وہ یہی حریتِ فکر تھی اور آبار و اجداد کی رسوم اور پابندیوں سے نجات۔

پہلی صدی کے اوائل اور دوسری صدی کے اوائل میں گو بہت سے مفاسد اور مضامین

۱۹۲۱ء۔ (۱۳۶۰ھ) کی بات ہے جب خاکسار فیروز پور (مشرقی پنجاب) کی جامعہ ابوحدیث
گنبدان والی میں مقیم تھا کہ مولانا محمد جعفر تھانیسری کی مشہور کتاب ”تاریخِ عجیبہ (کالابانی)“ کو عمدہ طریقہ
سے شائع کرنے کا ارادہ ہوا تھا، جس پر مقدمہ لکھوانے کی درخواست حضرت مولانا محمد اسماعیل، دگر دار
رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کی گئی۔ مرحوم و مغفور نے حسبِ عادت قلم برداشتہ نہایت فاضلانہ مقدمہ
کر کے بذریعہ خاکسار فیروز پور ارسال فرمادیا تھا لیکن افسوس! بوجہ کتابِ مذکور کی اشاعت کی قربت

تہو پہنچیں۔ تاہم عقل و دانش اور فہم و فراست کے کھلے اور وسیع دروازوں پر یہ قفل نہیں پڑتے تھے، جو چوتھی صدی ہجری کی پیداوار ہیں۔ پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے رفتار کا وہ ریلو جس نے سب سے پہلے کراچی کے راستہ ساحل (متحدہ) ہند کو عبور کیا، ایسے مقدسین پر مشتمل تھا جو اسلام کے آب زلال کو اس کے اصل سرچشموں سے حاصل کرنے کے عادی تھے۔

اس کے بعد علم کی کمی اور زمانہ نبوت کے بعد نے فرقہ پرستی کا یہ منہ پیدا کر دیا، جس میں آج کل ہم مبتلا ہیں اور بے حتی کایہ عالم ہے کہ خود اس وجود و تقلید پر فخر کرتے ہیں، علمائے امت اور ائمہ اصلاح و تجدید کے متعلق یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح قاصرانظر

۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے پر جو مختصر سے چند کاغذات راقم کے ساتھ آئے دہناروں کی قیمتی اور نادر ذاتی کتب اور بعض ضروری کاغذات تو وہیں فسادات کی نذر ہو گئے، ان میں خوش قسمتی سے حضرت کایہ ”مقدمہ کالاپانی“ بھی تھا۔

گزشتہ دنوں اتفاقاً معلوم ہوا کہ — طارق الہیدی — کے زیر اہتمام کتاب ”کالاپانی“ کا نازہ ایڈیشن نہایت احسن انداز میں زیر طباعت سے آراستہ کیا جا رہا ہے لہذا اب یہ مبارک مقدمہ اس کے ساتھ شامل ہے۔ ان اللہ بالغ امورہ قد جعل اللہ لکل شیعی قدراً۔

واضح رہے کہ یہ نگارش ۳۵ سال پہلے کی ہے جبکہ اگرچہ انگریزی راج کے آخری سال تھے، تاہم بھٹانوی استبداد موجود تھا جس کی طرف مقدمہ میں قدرے اشارات ہیں نیز ان ہی دنوں ایک دیوبندی سیاست دان مولانا نے ”علمائے ہند کا شاندار ماضی“ نامی کتاب تالیف فرمائی تھی جس میں نہ صرف کہ ”علماء“ کہلانے کا حق اپنے حلقے کے فقہائے احناف کو دیا گیا بلکہ ”شاندار“ کا کرڈیٹ بھی۔ چونکہ اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں بھی جماعت اہل حدیث تحریک آزادی وطن کے سلسلہ میں حضرت مقدمہ نویس اور مولانا ابوالقاسم بنارس کی قیادت میں علمائے دیوبند کے دوش بدوش سرگرم عمل تھے، اس لیے مولانا محمد اسماعیل مرحوم و مغفور کو دیوبندی مولانا کی خلافت اقدس تاریخ نویسی سے کچھ بیخفا قدرتی تھا، جس کا

تھے اور کتاب و سنت سے استدلال کی جرأت نہیں فرماتے تھے، پھر اس کے لیے ایسے حیل اور تاویلات پیدا فرماتے ہیں کہ جس سے ان حضرات کو بھی حیل کے فن کا جہتہ اعظم کہنے کو جی چاہتا ہے۔ عیب اور اس کا عدم احساس بلکہ عیب پر فخر ایسے امراض ہیں، جن پر امت کو ناز نہیں ہو سکتا بلکہ ذمہ امت سے سر جھک جاتا ہے اور اصلاح حال کا دلولہ، یا بس اور ناامیدی کا پیکر بن کر رہ جاتا ہے۔

ہر صدی میں ایسے لوگ موجود رہے جو وقتی خرابیوں کو دیکھتے اور ان کے بے قرار دل، ان کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے حدیث ”لایزال طائفة من امتی“ کا مقتضی بھی یہی تھا۔ ان تمام بزرگوں کا تذکرہ قید نہیں اس مختصر سی تحریر کا موضوع نہیں لیکن تاریخ کا ادنیٰ طالب علم آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ مصلحین، حسب حال ان تباہیوں کی روک تھام کرتے رہے اور اس راہ میں، بخت قید بلکہ دار و رسن تک کی صعوبتیں برداشت فرماتے رہے۔ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام سفیان ثوریؒ وغیرہ ائمہ اسلام ایک ایک اس

خفیہ سا ذکر مقدم میں ہے جس میں ان کو حق بجانب سمجھنا چاہیے۔

افسوس! مقدمہ میں مذکور تقریباً ”بھی حضرات جناب مقدم نویس کی طرح آج ہم میں؟

نہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

نکسار محمد عطار اللہ ضیف بھوجیا

ناظم المکتبۃ السلفیۃ، لاہور

غزہ محرم ۱۴۹۶ھ

لے ملاحظہ ہو ”العزاق“ بریلی کا شاہ ولی اللہ مہر مولوی شیر محمد جالندھری کا مضمون ”شاہ ولی اللہ حنفی“

(واضح رہے کہ مولانا مرحوم کی یہ تحریر اس زمانہ کی ہے جن دنوں یہ مولانا شائع ہوا تھا۔ ج، ح، ۴)

کی نظیر میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

سنت الہی | گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں حق و باطل کی آویزش نے ایک ایسے معرکہ کی صورت اختیار کر لی تھی کہ کفر و فسق کے شیوع اور تعلیمات اسلامی کے انحطاط نے دنیا کے ہرست و بود کو ظلمت کدہ بنادیا تھا، فجر اور بدعت کے بادل اس قدر محیط تھے کہ حق و صداقت کی کسی ہلکی سی کرن کے ظہور کی بھی امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن سنت الہی کے مطابق مختلف مقامات میں مصلحین امت کا ظہور ہوا۔ عرب میں یہ شرف خطہ نجد کو ملا اور حضرت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا انتخاب عمل میں آیا۔ گو یہ تحریک سیاسی نہ تھی، اصلاحی تھی لیکن بتدریج سیاسی ہو گئی کیونکہ اسلام کا نظام ہی ایسا تھا کہ وہاں سیاسیات سے الگ رہ کر کسی کامیاب اصلاح کی توقع ہی نہ تھی۔ یہ تحریک ”وہابی تحریک“ کے نام سے عرب میں کافی کامیاب ہے۔ اہل نجد اسی نام سے پکارے جاتے ہیں اور اسے شاید اپنے لیے پسند بھی کرتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کو عرب میں علمی اور سیاسی اقتدار حاصل ہے فالجہنم علی ذلک۔

دوسری تحریک | دوسری تحریک الجزائر اور ٹیونس میں شروع ہوئی جو ”سنوسی تحریک“ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ تحریک فرانس کے مظالم اور استبداد کی بدولت شروع ہوئی۔ سنوسی خاندان نے اس کی رہنمائی کی۔ گو یہ تحریک کھلے طور پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کے بیچ اس قدر گہرے ہوتے گئے کہ بالآخر فرانس کو لے ڈوبے۔ ملک کی اسی اندرونی ناراضگی نے ہٹلر کے مقابل فرانس کو چیت گرایا اور ملک سے اسے کوئی امداد نہ مل سکی، اس کی تفصیلات ہمیں مل سکیں اور نہ ہی اس وقت وہ مطلوب ہیں۔

تیسری تحریک | تیسری تحریک کے بانی حضرت شیخ جمال الدین افغانی ہیں۔ اس کی ابتداء ایران سے ہوئی، ہندوستان بھی اس سے متاثر ہوا بلکہ مصر، قسطنطنیہ اور یورپ تک اس کے اثرات پھیلے۔ آج بھی مصر میں زندگی کے آثار اسی کے سبب پائے جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ، میدر شید رضا اور شیخ مراغی اسی تحریک کے

مذاہقین سے ہیں، جنہوں نے اپنی عمریں یورپ کے سیاسی اقتدار کے خلاف اور عامۃ المسلمین کی اصلاح میں صرف فرمادیں۔ غرض، مسر کی راری بیداری شیخ جمال الدینؒ اور ان کے تلامذہ کی مساعی سے ہے۔ شکر اللہ مساعیہم

چوتھی تحریک اصلاح منحل حکومت پہلے بھی کوئی خالص اسلامی حکومت نہ تھی، اس کے نظام میں غیر اسلامی اثرات بہت زیادہ تھے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں بھی یہ حکومت وحدت اور شیعت کے اثرات سے مرکب تھی، باستان، ایک دو کے عموماً بادشاہ جاہل تھے، ان کی ہوا پرستیوں کے ساتھ علماء سور کے تعاون نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ علماء حق کو اس نظام سے صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ بادشاہوں کے نام مسلمانوں سے ملنے جلتے تھے۔ کبھی کبھار عید اور بھر کی نماز میں شریک ہو جاتے تھے، اس کے سوا وہاں اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔

اسلام کے اس ظاہری اقتدار کے سبب علماء حق ان سلاطین کے خلاف کوئی کھلا قدم اٹھانا پسند نہ فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ معاملہ وعظ و مواعظ اور انہام و انہام سے سنبھلے ہو جائے اور یہ سلاطین صحیح طور پر اسلامی نظام کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔ لیکن سلاطین کے لیے ناممکن تھا کہ وہ کسی اصلاح کو آسانی سے قبول کر لیں یا فحور و معصیت کو صرف علماء حق کی اورنگی یا نصیحت سے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں۔

جلال الدین اکبر اور اس کے رفقاء کی مفسدانہ مساعی اور اہل حق کی ذہنی تحریک دین کے لیے منصوبے اور عیاشیوں کی طرف کھلا ہوا رجمان، یہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا تاریک ترین اور کھلا ہوا باب ہے۔ جہاں شیخ محمد طاہر ٹنویؒ کیسے اہل اللہ کی پیشکش جاسکی،

۱۔ سید محمد جوہنوری کی طرف منسوب - ج ۲، ج

۲۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی لفظی ساری عمر ایسی ہی کوششوں میں صرف فرمادی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

نہ دوسرے اہل حق کی۔ وہاں اگر جادو چلا تو خانوادہ ملامبارک کا اور بس۔ **فحقاً للہ**۔

حضرت شاہ ولی اللہ

ان ناگزیر حالات کی بدولت قانونِ الٰہی کے موافق
ملازمِ اعلیٰ کی رخصت بھری نہ تھیں اس ظلمتِ کدہ کی

طرح متوتّر ہوئیں اور خانوادہ ملامبارک کی نجاستوں کو دُور کرنے کے لیے ان کی بجائے حضرت
شاہ عبدالرحیمؒ کے نانندان نے لے لی۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ملازمِ بابر کا نانندان بھلا اللہ
اکبر کے زیرِ سایہ تھا اور شاہ عبدالرحیمؒ کے تختِ جگر پر صرف ندا کا سایہ۔ ابو الغنفل اور فینسی کی
بھوک پیاس کا علاج شاہی محلوں اور اکبر کے قلعوں میں تھا اور اس نانندان کی ضروریات
اور روحانی پیاس کی سیرابی کا سامان حجاز و طیبہ میں۔ فشتانِ مابینہما۔ یہ لوگ ابوانِ خُمری
سے اتنے ہی بے نیاز تھے، جس قدر خانوادہ ملامبارک ابوانِ ہند اُندلی سے اسی لیے حضرت
شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علوم کے بعد درسِ حدیث کے لیے حجاز کا رخ کیا اور فتوایں
حدیثیہ کا ایک سببِ بہادیرِ حجاز سے ہندوستان کے لیے جن فرمایا اور سابقہ درسیات کے ساتھ
درسِ حدیث کو خاص اہمیت دی اور عمر کا باقی حصہ اسی راہ میں ختم فرمادیا۔

طابق درواقِ مدرسہ دقیل و قال درس

اینجا بجا کہ کوئے تو مادر نہادہ ایم

حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر حسبِ بیانِ حضرت نواب صدیق حسن خان مرحوم (ابجد العلوم
ص ۱۹۱۳) قریباً ۶۶ سال (پیدائش ۱۰۷۷ھ اور وفات ۱۱۴۶ھ) ہوتی ہے۔ یہ زمانہ ہندو
میں طوفانی انقلابات کا ہے، بیسیوں قوتیں دہلی کے تخت کی آرزو میں بسا طیاسیست پر آئیں اور
کامیابی یا ناکامی کے ساتھ ختم ہوئیں۔ بیٹوں نے اپنی سیاسی مصالح کی بنا پر باپ سے بغاوت
کی، بھائی بھائی سے لڑا۔ غرض اس عرصہ میں قریباً دس بادشاہ دہلی کے تخت پر قابض ہوئے
اور اسے چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے ايام میں بھٹانیوں نے
تختِ دہلی پر قابض ہونے کے لیے منغل بادشاہوں سے گھوڑیاں لے رہا تھا بلکہ ایک مدت تک

اس کا چنگل اس شکار پر پڑ بھی چکا تھا یہ تو ناممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ ایسا با بصیرت آدمی ان حوادث سے متاثر نہ ہو یا وہ ان نتائج سے بے خبر ہو، جو ان انقلابات کے بعد ان کے پروگرام پر پڑ سکتے تھے، جس کی تکمیل کی ذمہ داری حضرت شاہ صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی، جس کا تذکرہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ”تقنیات“ میں جا بجا اشارہ و صراحت کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی مثال ان حوادث میں اس پہا کی طرح ہے جو سمندر کے کناروں پر واقع ہو۔

شاہ صاحبؒ کا انداز اصلاح

سمندر کی موجیں اسے بار بار تھپیڑتی ہیں لیکن اس کے سکون میں کوئی جنبش نہیں پیدا کر سکتیں اس کے وقار میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اضطراب بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحبؒ کی تصانیف میں ان حوادث سے کوئی بے قراری یا قلق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک کوہ وقار جس نے اپنی اور دشمن فوج کی ساری حرکتوں کو دیکھا ہے، ناگزیر حالات کو سہارتا ہے اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لیے بڑھا جاتا ہے۔ ”حجۃ اللہ البالغہ“ کے ابواب میں خلافت الہی کی تائید اور تکمیل کے لیے جو خاک بنایا گیا ہے، اس میں بتدریج رنگ بھرا جائے گا اور اس ارادہ کی تکمیل ٹھیک اسلامی تعلیمات کے زیر سایہ ہوگی۔ اس کے لیے نہ نعرہ بھیر کا ارتعاش مطلوب ہے، نہ ”زندہ باد“ کی ہنگامہ آرائی۔

مقابل کی معنوں میں سے جہاندار شاہ ہو یا فرخ سیر، کوئی بھی اگر مقاصد سے ٹکرانے کے لیے آمادہ ہو تو ایک تبسم آمیز بے نیازی کے ساتھ اس کی دعوتِ مبارزت قبول فرمائی گئی ہے، لیکن اس سیاسی اہتکام نے مسلمانوں کی اندرونی بیماریوں سے ایک منٹ کے لیے بے پروا نہیں کیا۔ ”فتح الرحمن“ کی اشاعت، درس حدیث اور رد بدعات کا ہر سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہا ہے۔ ”حجۃ اللہ البالغہ“، ”تقنیات“ اور ”البلاغ المبین“ آپ کی تصنیفات پڑھنے والے ان محاذوں کو غور پہنچاتے ہیں، جن پر مجد وقت لو رہا تھا۔

۱۱۷۶ھ میں حضرت مجد وقت شاہ ولی اللہؒ

کی وفات کے بعد یہ ساری ذمہ داریاں شاہ عبدالعزیز

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ

صاحب کے حصہ میں آئیں۔ آپ کے دور میں ان مقاصد کے تین شعبے ہو گئے۔ سیاست، مل درس و تدریس اور پند و معیت اور ہر شعبہ حسب رجحان طبیعت شاہ صاحب کے تلامذہ کے حصے میں آیا اور ہر ایک نے ذمہ داریاں اپنی افتاء و طبیعت کے مطابق اٹھائیں، تاہم معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سب کارگزاریوں کی نگرانی خود فرماتے اور حسب ضرورت ہدایات دیتے تھے۔

فروع فقہیہ میں حنفی مسلک کا التزام خاندان میں حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے زمانہ سے ہی اٹھ چکا تھا بعض مشہور

خاندانِ دہلی اور حنفیت

مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند نہ تھے۔ جیسے قرأت فاتحہ خلف الامام؛ چنانچہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نمازِ جنازہ اور دوسری نمازوں میں اس کا التزام فرماتے تھے۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ فقہ اور بھی عیاں کر دیا؛ چنانچہ مولانا شاہ محمد فائز اثر الہ آبادیؒ کا ورور دہلی، آمین بالجہر کی نزاع اور شاہ صاحبؒ کا فیصلہ مشہور واقعہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتووں میں بھی فاتحہ کے متعلق مسلک شافعی کی کھلی حمایت پائی جاتی ہے (ملاحظہ ہو فتویٰ مطبوعہ کلکتہ) حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے تقلید جامعہ کے اس پہلو کو بالکل ہی بے نقاب کر دیا، ”تنویر العینین فی اثبات دفع الیٰسین“، لکھ کر حنفی مسلک کی حمایت سے بالکل دستکش ہو گئے اور رفع عند الکرکوع و بعد الکرکوع کو ترک رفع پر ترجیح دی جیسے حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی حجۃ اللہ باللہ میں ظاہر فرما چکے تھے (حجۃ اللہ باللہ ج ۲ ص ۸)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں حنفی مسلک کے پورے پابند بھی تھے، سید احمد

اظہار حقیقت

شہیدؒ کے لشکر میں دونوں فریقِ یاد و نون مسلک کے آدمی دوش دوش بدوش سکھوں سے ملتے تھے اور آپس میں ان مسائل پر کوئی ادنیٰ سی محاسمت یا آدیرش بھی نہ ہوتی تھی اور حق بھی یہی ہے معاملہ ایک سنت پر عمل یا اس کے ترک سے زیادہ نہیں اور نہ ہی سنہ و اورا، حدیث میں کفر و اسلام کا فرق ہے (تقلید شافعی پر جمود سے قطع نظر) ایسے اختلافات سلف سے خلف تک موجود

رہے ہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر نہ کسی کی تکفیر عمل میں آئی نہ تفسیق شخصی اجتہاد یا ترجیح سے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ ہر ایک اپنی تحقیق اور عوالب دید پر عمل کرنے میں آزاد تھا۔ ایک عجیب حقیقت ہے کہ اس تحریک میں اکثریت علماء کی تھی یکسوں سے جنگ کے بعد انگریز سیاست میں سے بھی مجاہدین کو الجھنا پڑا۔ انگریز شاہی طریقہ ان مخلصین میں ایسے اختلافات پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ یہ سب علم و دانش کی برکت تھی کہ اختلاف کے باوجود حدود اختلاف کو سمجھ لیا گیا تھا۔ یہی ایک نقص ہے جسے آج ہم اپنے اختلافات میں نہیں سمجھ رہے ورنہ وہ کون سا زمانہ ہے جس میں اختلاف خیال موجود نہ تھا اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی داعی قوتیں ایسی مستوی سطح پر آجائیں جہاں یہ فروعی اختلافات سرے سے ناپید ہی ہو جائیں۔

(مقدمہ) ہندوستان میں اس تحریک کے مؤبدین کے سامنے تین مقصد تھے۔

تحریک اصلاح و جہاد کا مقصد

(۱) آزادی فکر، تقلید و وجود سے بچ کر کتاب و سنت سے براہ راست اصول و فروع دینیہ کے سمجھنے کی کوشش کرنا اور ان تالوں کو قڑ دینا جو اس موہبہ الہی کے دروازوں پر لگائے گئے تھے، جسے عقل و دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ب) بدعات و محدثات کی مخالفت کرنا اور اسلام کی اس سادہ سیرت کو سمجھنے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنا، جو قرون اولیٰ میں موجود تھی اور جس پر سلفِ اول نے عمل کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔

(ج) دنیا میں حکومتِ الہیہ قائم کرنا اور سیاست کے مروجہ اس طرح بدل دینا کہ اسلامی نظام قائم ہو سکے یہی ایک طریقہ ہے جس سے دنیا کے مختلف مذاہب، جمعیات امن و چین اور مذہبی آزادی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

حضرت شاہ اسماعیلؒ کے وعظ اور دہلی کے باراڑا کی مجلسوں سے لے کر بالا کوٹ کے اس خوا

شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

معرکہ تک جو حق و باطل کی آویزش میں اس تہج کا آخری میدان کارزار تھا، برقیقت نمایاں ہے کہ توحید کی اشاعت، سنت کی ترویج، بدعت کی مخالفت، شرک اور اس کی اسلام سے بنگ اور ہر غیر شرعی نظام کے بدلنے کے لیے کتنے مضبوط ارادوں اور اس راہ میں مصمم عمل سے کام کیا گیا ہے اور اس بے جگر می سے کہ دنیا پر اسباب اسے دیکھ کر عقل و دانش کی راہ سے ان بانبازوں کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو باقی ہے۔ رضی اللہ عنہم وارضاهم۔ ایمان صحیح اور غلوں فی العلم ہی ایسے ذرائع ہیں جن سے اس تحریک اور اس کے محرکین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

بنا کر دند غوش رسے بجاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایس عاشقان پاک طینت را

مجھے ان جنگوں کی تفصیلات میں نہیں بانا ہے کہ مکھوں کو کہا

شکست ہوئی اور مجاہدین کہاں کہاں کامیاب ہوئے بلکہ

ایک غلطی کا ازالہ

مجھے اس غلطی کو اٹھانا ہے جو حیاتِ طیبہ کے معنی اور اس قسم کے ڈرپوک لوگوں نے اس تحریک کے متعلق پیدا کر دی ہے کہ بانیانِ تحریک کا مقصد صرف مکھوں کے مظالم کو ختم کرنا تھا انگریزی حکومت سے ان کی سلج تھی یا انگریزی مظالم ان کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ نہ تھے۔ تحریک کے متعلق ایسے نیالائت کا اظہار تحریک پر سب سے بڑا غلطی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا معرکہ جس میں مولانا مقصود علی، مولانا عبداللہ بن مولانا دلایت علی صاوقپوری کی قیادت میں شریک تھے۔ جس میں انگریزوں کی طرف سے جنرل نیوی چیمرس انگریزی عساکر کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ معرکہ قریباً چھ ماہ تک جاری رہا۔ ہنر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس معرکہ میں انگریزوں کے قریباً پانچ ہزار آدمی کام آئے اور اسی لڑائی کے نقصان سے ہوا انگریزوں کو ان غائب بدوش لوگوں کو خواہ مخواہ چھڑ کر ہوا لارڈ ولیمن ولسرے ہندو چنے کی پہاڑیوں میں حرکت قلب بند ہونے سے مر گئے۔ اس کا تذکرہ مولانا تھانیسری نے ”کالایانی“ کے شریعہ ہی میں کیا ہے اور (عربی)

مجدد انبیاء، "کاھنؤ (ہند) شعبان ۱۳۱۹ھ میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس کے بعد متواتر واقعات ہوتے رہے، جن میں اس لشکر کے بغیر السیف انگریزی مظالم سے اس طرح رونے جس طرح وہ مکہ مظالم سے بزد آ رہا ہوئے تھے۔

پیش نظر کتاب میں بھی ان کوششوں کے پس منظر کا تذکرہ ہے جو ان مسلم مجاہدین نے اس راہ میں کیں۔ پٹنہ کے دہائی کیس کی یہ سرگزشت ہے جو پچاسیوں یا عبور دریائے ستور کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مولانا جعفر تھانیسریؒ نے جس سلاست سے ان واقعات کو بیان کیا اور جس سادگی سے اس داستان کو دہرایا ہے وہ اپنی صداقت کی آپ گواہ ہے، اس میں جماعت اہل حدیث کی ان مساعی کو واضح کر دیا گیا ہے جو انہوں نے تخلص وطن کے باب میں کیں۔ فجزاہم اللہ عنا وعن المسلمین احسن الجزاء۔

درس و تدریس اور تحریک جہاد تحریک کا شعبہ جہاد جس کی فہم داریاں مولانا شہیدؒ کے سپرد تھیں بے حد فطرت تھیں۔ اسے

نہ سمجھ برداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز۔ اس لیے سب کے بعد ولی اللہی وستان کا ایک معتد بہ حصہ صرف درس و تدریس، وعظ و خطابت اور شرک و بدعت کی ترویج کی طرف غائب ہو گیا اور استخلاص وطن کے لیے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اور اپنے مسلک کے موافق دیوبند، سہانپور اور دہلی میں فقہ و حدیث کے مدارس کھول کر کتاب و سنت کی اشاعت میں اپنے اپنے طریق پر مشغول ہو گئے، دونوں جماعتوں میں فروعی اختلاف ضرور تھا لیکن عنا واد و شقائق بالکل نہ تھا۔

شیخ الکمل مولانا سید محمد زبیر حسینؒ کی درس گاہ حدیث اس زمانے میں دہلی کی درس گاہ و بابیت

کے نام سے زیادہ بدنام ہوئی، جس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلاح رسوم میں یا عریاں اور بے حجاب تھے۔ نیز اس شغل کے باوجود ان لوگوں نے مجتہد علی نظام کے قائم کرنے اور

غلام نظام کے توڑنے میں اپنی کوششوں کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رکھا اور اصحاب دیوبند و غیرہ اس فرض کی ادائیگی میں محتاط بلکہ خاموش ہو گئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس زلزلے میں آپ کو اس دور کی اس تحریک کے تذکرہ نگار غالباً تمام کے تمام اہل حدیث ملیں گے بعض لوگ مثلاً مولانا محمد میاں مراد آبادی مؤلف ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ اسے اتفاقی چیز سمجھتے ہیں لیکن یہ صرف اتفاق نہیں بلکہ واقعات کا صحیح نتیجہ ہے یعنی سٹھہء کے بعد ایک گروہ منور سے زیادہ محتاط ہو گیا اور دوسرا گروہ خدمتِ علم کے ساتھ استبداد کی مخالفت بھی کرتا رہا۔ اس لیے کچھ حنفی حضرات نے (بریلوی اور لدھیانوی قسم کے) اور کچھ برطانوی حکومت کے ارباب بسط و کشادگی اس جماعت (اہلحدیث) کو بدنام کیا۔ چنانچہ یہی لوگ ”وہابی مقدمات“ میں گھسیٹے گئے چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ پر مرقوم ہے کہ ”مولوی نذیر حسین صاحب جن پر واسطہ اظہار نام کل ممبران اہل حدیث باشندگان ہند کے جبر کیا جاتا تھا رہا ہو کر واپس آ گئے“ اور حالانکہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زیادہ تر مشغلہ درس حدیث کا تھا۔ سیاسیات میں ان کو چنداں دلچسپی نہ تھی، مگر ہماری سرکار (انگریزی) کا تو یہ حال ہے کہ غصہ آتا ہی کمزوروں پر ہے۔ حالانکہ حضرت شیخ الکل مولانا الشیخ السید محمد نذیر حسینؒ نے بعض انگریز بچوں اور عورتوں کی ہنگامہ سٹھہء میں مناسب اعانت بھی فرمائی تھی، کیونکہ ایسے معرکوں میں جہان مکمل ہو عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچانے سے شرعاً منع فرمایا گیا ہے۔

حضرت شیخ مولانا سید محمد نذیر حسینؒ (جو شاہ محمد اسحاقؒ کی ہجرت حجاز کے بعد ان کی علمی

حضرت شیخ الکلؒ کے تلامذہ

بانشینی کے سبب ”میاں صاحب“ کے لقب سے مشہور تھے، کی سیاسیات سے کنارہ کشی اور مشاغلِ درس کے باوجود میاں صاحبؒ کے تلامذہ سے ایک جماعت استخلاصِ وطن اور جنتِ البقیع کے قیام اور استحکام کے لیے بدستور سرگرم عمل رہی جن میں حضرت شیخنا الاکرم مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری حضرت شاہ عین الحق صاحب دخلیؒ سواہم رحمہم اللہ اجمعین خاص طور پر قابل

سال
۱۴۰۰ھ

ذکر میں جن کا تمام عمر بھی مشغول رہا۔ اپنے ذاتی اموال نیز احباب کے بھی ذکوہ و صدقات وغیرہ سے مجاہدین سقانیہ (چکر کنڈو اسس) کی اعانت فرماتے رہے۔ یہی وہ جرم عشق تھا جس کی یادداشت میں مولانا محمد بشیر عرف عبدالرحیم بن (مصنف سلسلہ مکتب اسلام) مولانا رحیم بخش رافت مسجد حنیفا نوالی لاہور، ہزاروں روپیہ کی تجارت پر لات مار کر برسوں سوات بنیر کی پہاڑیوں میں سرگرداں رہ کر وہیں ہمیشہ کی بند سوس گئے۔

یہی حال مولانا فضل الملی وزیر آبادی کا ہے جن کے سیاہ بال یاغستان کی برف میں سفید ہو گئے اور مضبوط صحت کا ایک نوجوان آج قعر شش جسم اور گری ہوئی صحت کے باوجود اسی لیلائے مراد کے وصل کی انتظار میں چمر قند کی سرنگھل پہاڑیوں میں اپنی موت کے دن کاٹ رہا ہے۔

جرم عشق تو ام نے کشد غوغا نیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تما شایست

ان بزرگانِ ملت میں بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فریضہ کو اس وقت ادا فرمایا جب کہ بہت سے علمائے ہند، جن کے ”شاندار ماضی“ پر آج بعض لوگوں کو ناز ہے ابھی یا تو مستقبل کی آغوش میں محو خواب تھے اور یا بدارس اور مساجد کی چٹائیوں کی زینت بن رہے تھے شاندار ماضی کے مصنف کی تنگ نظری اگر انہیں علماء میں جگہ نہیں دے سکی نہ سہی مگر جریدہ عالم کا زیب عنوان ان کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ واقعات کے ناراضگات قلم نے جس مقام رفیع پر ان کا نام کندہ کیا ہے، کسی متعصب اور تنگ نظر حاسد کی کم نگاہی اسے کبھی مٹا نہیں سکتی یہ ہے طے ثبت است بر جریدہ عالم دوام

آج جب کہ ”کالا پانی“ کا یہ ایڈیشن آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے اور یہ چند سطور بطور مقدمہ لکھی جا رہی ہیں، حالت یہ ہے کہ ”شاندار“

حال

کے لیے زمین تیار ہو رہی ہیں اور علمائے عال صرف ”فاتح خلف الامام“ اور ”نبیل الفرقہ“ ایسی تصانیف میں مشغول ہو کر اپنے علم کی داد

نایب محمد انور شاہ مرحوم کی تالیف کردہ ہیں جن میں حنفی اہلحدیث میں نقد و اعتراضات
نہ زور حمایت کی گئی ہے۔ (ع، ح)

لے رہے ہیں، اور فصل الخطاب کے لیے صرف یہی چند مسائل رہ گئے ہیں جن پر امت مسلمہ کے شاندار یا تاریک مستقبل کا انحصار سمجھا جا رہا ہے۔ ہمارے مدارس کے طلباء دیوبند سے آئیں یا دہلی سے مٹھی ہوں یا الحدیث ان کی نگاہ میں سب سے بڑا جادو جمل و مناظرات کی وہ محفلیں ہیں جن میں ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ رحمہم اللہ کے فروعی اجتہادات پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے اور ان خلد مکان بزرگانِ ملت کی فرج و شکست کا جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے غالباً یہ ”بہاد“ اس لیے فرض قرار دیا گیا ہے کہ اگرگز بہادر کی شریعت“ اسے جرم قرار نہیں دیتی ورنہ اس سے بھی کوئی زیادہ شنیع مشغلہ تلاش کرنا پڑتا۔

حسامتہ کتاب آپ کے سامنے ہے اور اپنے بزرگوں کے کا زامے ان کے مقاصد کی تفسیر کر رہے ہیں اس راہ کے مصائب حکومت کی گرفت، اقلات مال، اقلات جان غرض منزلِ عشق کے سارے آثار آپ کے سامنے ہیں۔ آپ ہیں اور اپنے مستقبل کی تعمیر آپ کا فرض، حکومت الہیہ کی تشکیل آپ کا ذمہ، ماضی کو دیکھیے اور مستقبل کو بنائیے۔ جواہر آپ کی سربلندی پر منتج ہو سکے اس کی طرف قدم اٹھائیے۔ خدا تعالیٰ کی محبت ان نیک بندوں کا ساتھ دیتی ہے، جو اس کے قانون کا احترام کریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیْہُمْ سَبِیْلًا۔

آج کی مشکلات اس وقت کی مشکلات کی نوعیت، گو اس وقت کی مشکلات مختلف ہے لیکن عزم و ارادہ کی پختگی، تمام مشکلات کا صحیح حل ہے اپنی سربلندی کے لیے کوشش انسانی فطرت کا نٹھنے والا فرض، اس کی مشکلات سے گھبرانا اپنی فطرتِ عذاری کے مترادف ہے۔ جماعت اہل حدیث کے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید و سنت کی اشاعت اور اسلام کی سربلندی کے لیے بڑھیں۔ اِنھَا لِاحْدَى الْکُبَرِ مِنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَخَذِرَ۔

محمد اسماعیل کان اللہ

خطیب مسجد اہل حدیث۔ گوجرانوالہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ ۳/۹

سُخنہائے گفتنی

بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں تبرِ صغیر پاک و ہند کے اُفتی پر بادل چھائے ہوئے تھے، سیاہ بادل، شرک و بدعت کے بادل، جہالت و بربریت کے بادل — وہ مسلمان، جن کے قدمِ مہینت لزوم سے یہاں صدیوں قال اللہ و قال الرسول کے دلائل و نغصے روح کو سرور بخشے رہے، آج خود اللہ اور رسول سے دور ہو بیٹھے تھے، کتاب و سنت کو کسفرِ فراموشی کر بیٹھے تھے — وہ مسلمان، مدتِ مدید اور عرصہٴ بعید تک جن کی عظمت و شوکت کے پرچم یہاں لہراتے رہے، آج در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، ان کی سلطنت کا چراغ، چراغِ سحر کی طرح ٹٹٹھا رہا تھا، ان کی جمعیت کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ الغرض مذہبی، علمی، تمدنی اور سیاسی ہر اعتبار سے مسلمان قوم بے امتیاز و ال اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھی۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی حالت پر ایک بار پھر رحم فرمایا اور صغیر پاک و ہند کے اُفتی پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی شخصیت نمودار ہوئی جنہوں نے تاریکیوں اور گمراہیوں کے اس ظلمتِ کدہ میں حق کے چہرہٴ راغ روشن کیے، جنہوں نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں ایک حد تک انقلاب برپا کر دیا لیکن دنیا ابھی کسی دوسرے ہی مردِ میدان کی منتظر تھی۔ یہ مردِ میدان حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حقیقی پوتے تھے اور ان کے خواب کی تعبیر بھی۔ امام محمد اسماعیل شہیدؒ نے اپنے محترم دادا کے مشن کی تکمیل کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اصلاحِ اعمال و عقائد کے لیے برسرِ بازار وہ کام کیے جن کے کرنے کی بڑے بڑوں کو بندھجروں کے اندر

بھی تاب نہ تھی۔ امام السند مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ آج اگر شاہ ولی اللہؒ بھی زندہ ہوتے تو وہ امام محمد اسماعیل شہیدؒ ہی کے جھنڈے تلے کام کرتے۔

امام محمد اسماعیل شہیدؒ نے ایک طرف دین و عقائد اور اخلاق کی اصلاح کے لیے بیچنا کام کیا، جہاں تہاں تشریف لے گئے، آپ کے علم و فضل کی بدولت دلبتان کھتے گئے جن سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی صدائیں گونج اٹھیں اور تقویۃ الایمان، ”مُنْصَبِ امامت“ اور ”حَقِیْقَات“ وغیرہ کے معطر جھونکوں سے مشام جان بھوم بھوم اٹھے۔ دوسری طرف آپ سکھوں، مرہٹوں اور انگریزوں کے آلام و مصائب سے نجات دلانے اور مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ واپس لے کر دینے کے لیے سر پر کفن باندھ کر میدانِ کارزار میں کود گئے حتیٰ کہ اپنے مقتدرِ غون سے بالاکوٹ کی وادیوں کو لالہ زار بناتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر۔ زوری سجدہ می خواہی زخا کی بسیش ازاں خواہی چنناں خود رائد داری کہ بایں بے نیازی ہا۔ شہادتِ بروہو خود ز خونِ دوستاں خواہی حضرت امام محمد اسماعیل شہیدؒ، ان کے بے مثل پیر و مرشد حضرت سید احمدؒ اور جانا بازِ رفتہ کی شہادت کے بعد، بقیۃ السیف مجاہدین نے دعوتِ اصلاح و جہاد کا علم سرنچوں نہ ہونے دیا بلکہ اس بے سروسامانی کی کیفیت میں جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اللہ کے نام سے آئے بلند سے بلند تر رکھنے کی کوشش کی اور عزیمت و استقامت کی وہ آگ لگا دی جس کے شعلوں نے پچیس سال تک سکھوں اور ایک سو سال تک انگریزوں جیسی زبردست جابر قوم کو مسلسل آتشِ زیر پا رکھا اور لطفِ یاسم کی بات یہ ہے کہ یار لوگوں کو ابھی تک اصرار ہے کہ ان مجاہدین کا جہاد انگریزوں کے نہیں بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھا۔

امام محمد اسماعیل شہیدؒ، ان کے جانا بازِ فقار اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تحریک کو زندہ رکھنے والے مجاہدین کی یہ داستان ہماری ملی غیرت اور اسلامی حیثیت کی سب

سے پر تاثیر و استان ہے۔ ان اللہ والوں نے اللہ کی خاطر آلام و مصائب کو برداشت کیا، آتش باریوں اور شمشیر زنیوں کی ہنگامہ آرائیوں میں جانیں دے دیں، خاندان، گھر بار اور جائیدادوں کی قربانیاں دیں، جیل کی کال کو ٹھٹھیلوں اور جزائر انڈیا کی لاپانی کی بھیانک اور خوفناک وحشت ناکیوں میں دن بسر کیے لیکن جبین عزیمت پر کبھی شک نہ آنے دی اور پاک استقامت میں کبھی لرزش پیدا نہ ہونے دی۔ زندگی کے ہر آرام اور ہر عیش کو نوکِ حقارت سے ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، تنہا تھی تو ایک اور صرف ایک ہی تھی کہ اپنی شہ رگ کے گرم گرم خون شجرِ اسلام کو سیراب کریں۔

لرزتی ہے ان سے نگاہِ حیات

یہی لوگ ہیں حاصلِ کائنات!

انہی حاصلِ کائنات، "قسم کے لوگوں میں سے ایک محمد جعفر تھانویؒ بھی تھے۔ آپ تھانوی صلیع انبالہ کے باشندہ تھے۔ والد صاحب کا نام میاں جیون تھا۔ ۱۸۳۲ء میں ولادت باسعادت ہوئی۔ عمر شریف کی بھی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد کا سایہ شفقت بر سے اٹھ گیا۔ ۱۸۵۶ء تک تحریکِ مجاہدین میں باقاعدہ طور پر داخل ہو چکے تھے۔ آپ تحریک کے سینئر ممبر اور بہت بڑے رازدار تھے۔ سرحد کو روپیہ اور مجاہدین کی فراہمی آپ کے ذمہ تھی۔ آپ علماءِ صادقوں کے محاذِ علیہ اور ان کے راز ہائے سرستہ کے امین و محافظ تھے۔ جنگِ اہلبید کے بعد جب ۱۸۶۲ء میں انبالہ کا مشہور مقدمہ ظہور پذیر ہوا تو حکومت نے اس یقین پر کہ سرحد پر مجاہدین کی مالی و جانی ہر طرح کی آپ امداد کرتے ہیں، آپ کی خانہ تلاشی کا پروگرام بنایا، آپ نے راہِ فرار اختیار کی تو حکومت نے گرفتاری کے لیے دس ہزار روپے کا اشتہار جاری کر دیا۔ آخر کار علی گڑھ میں پکڑے گئے تو پھر انبالہ لائے گئے، مقدمہ چلایا گیا جس کا ۲۲ مئی ۱۸۶۲ء کو فیصلہ سنایا گیا کہ تمام جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط اور پھانسی کی سزا۔ آپ کو ہر طرح کا لالچ بھی دیا گیا اور طرح طرح کے آلام و مصائب کا نسخہ مشتق بھی بنایا گیا مگر سی طرح

جی آپ کے پایہ استقلال میں ذرہ بھر خشیدیا نہ ہوئی، آپ نے اس مقدمہ میں نہایت عزیمت و استقامت کا مظاہرہ فرمایا۔ مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے جج آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا :-

”تم بہت عقلمند، ذی علم، قانون دان اور اپنے شہر کے فہر دار اور رئیس ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا، تمہارے ذمہ سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ جیتا بھی غیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی اور آخر میں یہ گلہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت غصہ ہوں گا۔“

آپ نے فیصلہ سن کر قطعاً کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ فرمایا آخری الفاظ کے جواب میں جج کو نہایت پامردی سے جواب دیا :-

”جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ

رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔“

آپ کے یہ الفاظ ایک مظلوم کی زبان سے نکلے ہوئے تھے جو آسمانوں کو پیرتے ہوئے سینے عرش بریں تک پہنچے۔ قدرت نے انہیں سچا ثابت کر دکھایا اور چند روز بعد وہ جج اپنی موت آپ مر گیا۔

ادھر پھانسی کی سزائیں کر آپ پر سترت کی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ انگریز یہ دیکھ کر شذر رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ پھانسی کی سزا کا حکم سننے کے بعد بھی کوئی انسان اس قدر بشاش و بشاش رہ سکتا ہے، چنانچہ آپ کو دیکھنے کے لیے جیل میں انگریزوں اور میوں کا قافلہ بندھ گیا۔ کسی انگریز نے آپ سے پوچھا کہ پھانسی کی سزا سننے کے بعد یہ سترت

کیسی؟ آپ نے ایمان پر درجواب دیا! ”راہِ خدا میں جان دینا ہمارے نزدیک بڑی سعادت ہے اور ہمارے دین میں اسے شہادت کہا جاتا ہے۔“ اللہ اللہ یہ کیا انسان تھے، چڑھتی ہوئی آندھی تھے کبڑھتے ہوئے طوفان تھے ع

ہلاکت نہ تھی موت اُن کی نظر میں

یہ کیا تڑپ تھی! کیا جذبہ تھا! کیا ایمان تھا!!! ع

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی!

آخر کار انگریزوں نے آپ کی پھانسی کی سزا کو جس دوامِ عبور وریائے شور میں تبدیل کر دیا تاکہ شمعِ حریت کے اس پروانے کو آلام و مصائب کی آگ میں زیادہ سے زیادہ جلایا جاسکے۔ ستمبر ۱۸۶۲ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک آپ انبالہ جیل میں ہی پابندِ زنجیر و سلاسل رہے اور پھر لاہور پہنچا دیئے گئے۔ ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء کو لاہور جیل سے روانہ ہوئے اور ملتان، سکھر، ٹھٹھہ اور کوٹری ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ ایک ہفتہ کراچی جیل میں رہنے کے بعد بادبانی جہاز کے ذریعہ بمبئی روانہ ہو گئے، وہاں ایک ماہ تھا کہ جیل میں مقیم رہتے ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہاں سے روانہ ہوئے اور آخر کار ۱۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو آپ انڈیمان پنچ گئے۔ سترہ سال و دس ماہ بسر کرنے کے بعد انڈیمان سے ایک بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے نقد لے کر ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو ہندوستان روانہ ہوئے اور ۲۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو ۹ بجے شب انبالہ چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اس طرح تقریباً ۱۸ برس کے بعد اس مردِ مجاہد کو وطن کی مقدس سرزمین دیکھنا نصیب ہوئی۔

”کالا پانی“ اسی درتیمِ بعلِ شبِ چراغ، یا قوتِ احمرِ مردِ حق آگاہِ مہذبہٗ تھائیرِ ” کی خودنوشت سرگذشت ہے جس میں آپ نے جزائرِ انڈمان سے واپسی پر اسباب کے اصرار پر اپنی گرفتاری، مقید، سفرِ انڈیمان، انڈیمان کی زندگی کے حالات، نہایت

دلنشین انداز میں تحریر فرمائے۔ یہ کتاب کئی مرتبہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ پہلا ایڈیشن خود مولانا تھانوی نے اس داستانِ آلام و مصائب کے ختم ہونے کے بعد "تاریخ عجیب المعروف بہ تاریخ عجیب" کے نام سے شائع کیا تھا، جو کہ بالکل چھوٹے سائز پر تھا اور اس میں کوئی باب یا ذیلی سُرخ نہ تھی۔ اس ایڈیشن کا ایک نسخہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی لائبریری میں موجود ہے۔

اس کے بعد صوفی کچنی منڈی بہار الدین نے ابواب اور ذیلی سرخیاں قائم کر کے اسکے متعدد ایڈیشن شائع کیے۔ ۱۹۳۵ء میں مکتبہ سلفیہ ملتان نے اور ۱۳۴۳ھ میں اقبال اکیڈمی لاہور نے اس کتاب کی اشاعت کی سعادت حاصل کی۔ اسی طرح نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن نے "ایک مجاہد کی ڈائری" کے نام سے عمدہ کتابت و طباعت سے شائع کیا، جب کہ نفیس اکیڈمی کراچی نے مکتوبات سید احمد شہید (جو کہ سوانح احمدی کا ایک حصہ ہے) کے آخر میں اسے بھی ساتھ ہی لگا کر شائع کیا ہے۔ فاروقی کتب خانہ ملتان نے بھی اس کتاب کے بعض ایڈیشن "کالا پانی"، اور بعض "اسلامی تحریک کا مجاہد" کے نام سے شائع کیے ہیں۔ مورخہ الزکریا سے موسوم ایڈیشن کے آغاز میں تقریب اشاعت کے نام سے حافظ عبدلنعم سلیم کا مختصر سا ابتدائیہ ہے جبکہ اسلامی تحریک کا مجاہد کے نام سے شاہین فاروقی کا قدر مفصل اور زوردار پیش نظر ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت قابل ذکر ایڈیشن سلمان اکیڈمی کراچی نے تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی کے نام سے ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع کیا، جسے ہمارے فاسل دوست جناب محمد ایوب صاحب قادری نے مرتب کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا تعارف جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی اور پیش لفظ جناب نیل جالبی کے قلم سے ہے۔ جبکہ خود قادری صاحب نے ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے۔ متن کی تشریح و توضیح کے لیے بابا حفیظہ اشقی لکھے ہیں۔ کتاب میں مذکور شخصیات کے احوال و کوائف "مذکرہ رجال"

MODERN TREND

کے نام سے مرتب کیے ہیں اور آخر میں جدید رجحان کے مطابق کتابیات و اشارات کی فہرست بھی دی ہے۔

جناب محمد ایوب صاحب قادری اپنی اس علمی خدمت کے باعث جہاں ہمارے شکریہ کے بطورِ خاص مستحق ہیں، وہاں ہمیں ان سے شکوہ بھی ہے کہ وہ اپنے ذبیح اور مفلس مقدمہ میں عدل و انصاف کا مظاہرہ نہ فرما سکے، جس کی ہمیں ان کے علم و فضل سے توقع تھی، چنانچہ سید محمد شہید اور حضرت امام محمد اسماعیل شہید کی تحریک جہاد، مجاہدین کی قربانیوں، انگریزوں کی دشمنیوں اور اپنوں کی غداریوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”غیروں اور اپنوں کے اس رویے سے بدنام و بانی“ گھبرا اٹھے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جہاد کی تحریک اندرون ہند پاکستان قطعی طور سے ختم ہو گئی۔ اپنے لئے ”وہابی“ کی بجائے اہل حدیث“ کا نام مروج و مشہر کیا۔ انہوں نے باقاعدہ وفاداری حکومتِ برطانیہ کا اعلان کیا۔ مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں ”وہابی“ کے بجائے ”اہل حدیث“ لکھ جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔ غرض انگریز نے اپنے بے پناہ مظالم اور شاطرانہ سیاست سے اس اسلامی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ تحریک کا رخ بدل گیا اور اب وہ چند فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی۔

قادری صاحب کا یہ سارا بیان تاریخی غلطیوں اور غلط فہمیوں کا شاہکار ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ گروہی تعصب کا شدید شکار ہیں۔ سوچیں کبھی سیکم یا کسی مخفی جذبے کی تسکین کی خاطر آپ آئے دن اس قسم کی تحقیق پیش فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ یہ تحقیق جو آپ نے ”کالا پانی“ کے اس مقدمہ میں پیش فرمائی ہے، اسے سن و سن اپنے اس مقدمہ

میں بھی دوہرا چکے ہیں جو آپ نے حیات سید احمد شہیدؒ (نفیس اکیڈمی کراچی) پر لکھا ہے۔
 بلا کم و کاست ان خیالات کا اظہار اپنی تازہ کتاب ”جنگ آزادی“ میں بھی کیا ہے۔
 آپ نے اپنے خیالات کا اظہار غالباً سب سے زیادہ کھل کر سر سید احمد خاں اور وہابی تحریک“
 نامی اس مضمون میں کیا تھا جو جولائی ۱۹۷۰ء کے ”البلاغ“، کراچی اور ”چٹان“ لاہور میں
 شائع ہوا تھا۔ اسی وقت ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبدالحق صاحب قدوسی
 لاہور نے تیرہ قسطوں پر مشتمل اپنے ایک مفصل، مکمل مستند اور مدلل مضمون میں قادری صاحب
 کی اس تحقیق کا پوسٹ مارٹم کیا تھا، جو کہ ہفت روزہ ”الاعتماد“ لاہور میں شائع ہوا تھا۔
 خیال تھا کہ ان ٹھوس تاریخی دلائل و براہین کو دیکھ کر قادری صاحب اپنے خیالات پر نظر ثانی
 فرمائیں گے۔ افسوس کہ قادری صاحب کی تازہ کتاب ”جنگ آزادی“ دیکھ کر ہماری یہ خوش
 فہمی غلط ثابت ہوئی اور انہوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ”کل ایۃ اوحدیث یخالف
 ما علیہ اصحابنا فھو ما ڈل او منسوخ“

قادری صاحب کی ایک بار پھر اس تحقیق کو دیکھتے ہوئے خیال ہوا کہ ہم بھی ”کالا پانی“
 کے اس مقدمہ میں اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے جائیں۔ لیبلٹک من ہلک عن بینۃ
 دیچی من سچی عن بینۃ۔

قادری صاحب کے مقدمہ سے پیش کیے ہوئے مذکورہ اقتباس سے بھی
 پہلے ان کے یہ ارشادات پڑھیے۔

”حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے تحریک جہاد کو بری طرح کچلا۔ مجاہدین اور
 مصالحین کو وہابی کے نام سے موسوم کر کے بدنام کیا گیا۔ تمام ملک میں ہابیوں
 کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے ان
 کے حالات اور سرگرمیوں کی کیفیت طلب کی۔ ایک حکمہ سراغ رسانی اسٹیٹس

۱۔ لاہور فرماتے جلد نمبر ۲۲ شمارہ ۸۰، ۱۷، ۱۴، ۱۵، ۳۰، ۴۲، ۴۵، ۳۰، ۱۹۷۰ء۔

کے لیے وجود میں آیا۔ حکومت انگریزی نے باغی اور وہابی مترادف الفاظ قرار دیتے۔ عامۃ المسلمین میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا اور ایک عام معاشرتی انقطاع شروع کیا گیا۔“

تحریک جہاد اور مجاہدین کی اس شکست و ریخت کے سلسلہ میں گزراشیں یہ ہے کہ انگریزوں کے طرز عمل کا شکوہ بجا ہے، آخر وہ تو دشمن تھے، ان سے ہر بات کی توقع تھی۔ مجاہدین نے جب انہیں تقریباً سو سال تک آتش زیر پا رکھا تو انہوں نے بھی انتقام کے لیے ہر ممکن جز اختیار کیا۔ افسوس تو اپنے میر صادقوں اور میر جعفروں پر ہے۔ انگریزوں سے شاید ہمیں اتنا نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ اپنوں کی غدا ریوں اور سازشوں سے۔ قادری صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ یہ سراغ رسانی کے فرائض انجام دینے والے کون تھے؟ نفرت کا جذبہ کن لوگوں نے پیدا کیا؟ اور یہ انقطاع کرنے والے کون تھے؟

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سیدین شہیدین کی جماعت میں اہل حدیث اور احناف دونوں گروہ موجود تھے اور ان کی برکت سے بنگالستانِ مجتہد میں حرر و پریناں لیکن حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کی شہادت کے بعد جب جماعت کی زمامِ اہلحدیث بزرگوں کے ہاتھ آئی تو علماءِ احناف آتشِ حسد سے جل اٹھے، چنانچہ انہوں نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی، تعاون سے انکار کر دیا اور دن بدن دُور سے دور تر ہوتے چلے گئے چنانچہ حقیقی مکتب فکر کے مشہور بزرگ مولانا کرامت علی چونیوہری، جو کہ سید صاحب کے خلفاء میں سے تھے، ان کے متعلق خود قادری صاحب رقمطراز ہیں کہ:-

”آپ نے انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ

دیا تھا۔“

۱۔ مقدمہ ”کالا پانی“ از محمد ایوب قادری ص ۲۸-۲۹

۲۔ تذکرہ علماء ہند ص ۳۵۶

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندویؒ نے بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

مجاہدین اور اتباع سید احمد شہیدؒ کے سب سے بڑے واقف کار مسٹر جمیس اوکنلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پکے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو دیا گیا، جسے خود ان کے پوتوں نے فوریہ ۱۹۱۲ء میں درج کر لیا تھا (وہ خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں ان کے صاحبزادے اور مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جونپوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ حقاۃً و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحاب خاص کی روش سے بالکل الگ تھے۔

نہ صرف یہ کہ علماء احناف نے تحریک جہاد سے علیحدگی اختیار کر کے اس کی مخالفت شروع کر دی بلکہ انگریزوں کے ساتھ الفت و محبت کے رشتے قائم کیے، سرکاری ملازمتیں اختیار کیں اور مکمل وفاداری کا ثبوت دیا۔ دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا ملک علی ساری زندگی سرکاری ملازمت سے وابستہ رہے اور مکمل وفاداری اور کامل انہماک اور خلوص کے ساتھ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے دن رات مسلسل محنت کرتے رہے، چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں :-

”نانوتہ میں مظاہر العلوم کے مدرس اول مولانا محمد مظہر نانوتوی، احیاء العلوم کے مترجم مولانا محمد احسن نانوتوی، دیوبند میں مولانا ذوالفقار علی (حضر شیخ الہند کے والد ماجد)، مولانا فضل الرحمن (مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد) اور اس قسم کے بیسیوں بزرگ جو ہم پاتے ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ مشہور ہیں، ان

لہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۴۷۔ حاشیہ

میں سے بعض حضرات انگریزی حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیمات کے انسپکٹر بھی تھے مثلاً شیخ المند کے والد ماجد اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد دونوں حضرات کا جو حال ہے، جہاں تک میرا خیال ہے اس علاقہ کی اس جدید علمی روشنی میں بہت زیادہ دخل مولانا مملوک علی کے وجود و باوجود کو ہے۔ دلی پہنچنے اور وہاں کی تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہونے کا موقع ان بزرگوں کو بظاہر مولانا مملوک علی کی وجہ سے میسر آیا۔“

مولانا مملوک علی کے اکثر تلامذہ کی کیفیت بھی بالکل یہی تھی، مولوی سمیع اللہ آپ کے مشہور شاگرد ہیں، انگریزوں کو ان پر بڑا اعتماد تھا، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے انہیں ایک خاص مشن پر مصر بھیجا، چنانچہ جناب قادری صاحب نے خود بھی ان کے متعلق لکھا ہے کہ :-

”۱۶ ستمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں انہوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی۔ ایم۔ جی۔ کا خطاب ملا۔“

اسی طرح مولانا محمد احسن نانوتوی، دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد ماجد مولانا فضل الرحمن، مولانا محمود الحسن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی اور دیگر بے شمار اکابر علماء احناف کی اکثریت کسی نہ کسی طرح سرکار انگریزی سے منسلک ہو گئی اور رسم شبیری اوکرنے کے لیے اکیلے اہل حدیث میدان میں رہ گئے۔ تعجب ہے کہ قادری صاحب انگریزوں کی ستم رانیوں کا تو ذکر کرتے ہیں اور ان برادران یوسف کی نوازشوں کو بھول جاتے ہیں۔ انگریزوں کی بربریت سے شاید اس قدر نقصان نہ پہنچا ہو جتنا کہ

ملے سوانح قاسمی بحوالہ ”مولانا محمد احسن نانوتوی“ ص ۷۳ ملے ”مولانا محمد احسن نانوتوی“ ص ۱۸۴

اپنوں سے آہ

من انبیگانہاں ہرگز نہ نام
کہ ہرچہ کرد با من آشنا کرد

”اگر ایک طرف ولیم ولسن ہنٹر نے ”آورانڈین مسلمانس“ لکھ کر ان کے خلاف حکومت کو مواد مہیا کیا تو دوسری طرف مولانا فضل رسول بدایونی دت (۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) اور ان کے تلامذہ نے غریب ”وہابیوں“ کے خلاف تصنیفات کا ایک انبار لگا دیا۔“

فضل رسول بدایونی اور ان کے ہمنواؤں کو چھوڑ کر ان کا اول و آخر مقصد ہی سپیٹ کی پوجا اور انگریز بہادر کی خوشنودی تھی فضل رسول بدایونی نے اگر ان پاکباز مجاہدین اور ان کے افکار و نظریات کی تردید میں اپنا پورا زور و قلم صرف کر کے ”سیف الجبار“، ”احقاق الحق و ابطال الباطل“، ”البارق المحمدیہ لرحم الشیاطین النجدیہ، تصحیح المسائل“ اور مجموعہ رسائل و فوائد وغیرہ کتب لکھیں تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ وہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے اور انہیں جی نہ نک ادا کرنا ہی تھا، انہیں اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی تو اکثر و بیشتر کتب بھی سرکاری ملازمین کی اعانت ہی سے شائع ہوتی ہیں فضل رسول بدایونی اور ان کے ہم نواؤں کی اس خدمت اسلام کی تفصیل کے لیے دیکھئے ہماری کتاب ”تذکرہ شہید“ سروسٹ سوال یہ ہے کہ کیا فضل رسول بدایونی اور اس کے تلامذہ کی نسبت ارباب ویو بند کا کردار مختلف تھا؟ کیا انہوں نے اہل حدیث پر مسجدوں کے دروازے بند نہ کیے؟ معاشرتی انقطاع نہ کیا؟ ان کے خلاف فتوے مرتب نہ کیے؟ کتابیں نہ لکھیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس مقدس مہم کے آغاز کا سہرا ہی مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے جدِ مجدد لدھیانوی کے سر پہ ہے جنہوں نے ”انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد“

علہ مقدمہ کالاپانی ص ۲۹

نامی ”کتاب مقدس“ میں ان ”غریب و بایوں“ کو مرتد قرار دیا اور حکام بالا سے ان کے قتل کا مطالبہ کیا اور اسی پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اسلاف دیوبند نے مولوی محمد لدھیانوی کو مزید ٹھک پہنچانے کے لیے ایک اور فتویٰ کا اہتمام کیا، جس کا نام تھا ”جامع الشواہد فی اخراج الوہابیتین عن المساجد“ اور اس پر لدھیانہ، دیوبند، گنگوہ، رامپور، پانی پت اور دیگر بہت سے شہروں کے مفتیان احناف کی مرس اور دستخط ثبت تھے۔ کالا پانی کے مقدمہ میں تو قادری صاحب نے صرف بدایونی صاحب اور ان کے تلامذہ کا ہی ذکر کیا لیکن مقام مسرت ہے کہ وہ گھر کے مجیدوں سے بھی آگاہ ہو گئے ہیں اور اب انہوں نے مولوی محمد لدھیانوی مولوی وصی احمد سورتی ثم سیلی پھتی اور مولوی نبی بخش حلوائی کی ان خدمات جلیلہ کی طرف بھی دینی زبان سے اشارہ کر دیا ہے۔

اسی زمانہ میں سرتاج اہل حدیث اور سرخیل مجاہدین حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دیوبند کے ساتھ ارباب دیوبند خصوصاً حاجی امداد اللہ صاحب مولانا رحمت اللہ کیرانوی مولوی خیر الدین اور مولوی عبدالقادر بدایونی نے سرزمین حجاز میں ”جو حسن سلوک“ کا مظاہر فرمایا وہ تاتار کا ایک المناک باب ہے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولوی محمد حسن بھلی، مولانا محمد قاسم نانوتوی رضی اللہ عنہ مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی جیسے علماء دین نے اہل حدیث کے خلاف جس لب و لہجہ میں گہرا فحشانی فرمائی، وہ تاج کے اوراق میں ثبت ہے۔ مولوی محمد حسن بھلی نے تو اس قدر کوشش و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان استعمال فرمائی کہ بدایون والوں کے حاشیہ خیال پر بھی نہ کھٹکی ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیے۔ نظر الفرائد حاشیہ شرح عقائد“

اس سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے قادری صاحب کے ان ارشادات کو ایک بار پھر پڑھیے، جو پہلے اقتباس میں مذکور ہیں اور پھر خود انصاف سے فرمائیے کہ حکومت برطانیہ کے وفادار اہل حدیث مجاہدین تھے یا ارباب دیوبند؟ اگر عدل و انصاف

کے دامن کو حاکم کر تاج کے صفحات کی ورق گردانی کی جائے تو یہ حقیقت طشت از بام ہو جائے گی کہ جب بڑے بڑے اصحاب جبہ و دستار، دیوبند اور سہارنپور کے مدرسوں کے بندجروں کے اندر بھی انگریزوں کے خلاف کوئی بات منہ پر لانے کی جسارت نہ کر سکتے تھے، تو وہ صرف اہل حدیث جاننا ہی تھے جو انگریز سو رماؤں کو لوہے کے چھنے چہوار ہے تھے۔ جناب قادری صاحب خود ہی انصاف سے فرمائیں کیا یہی وفاداری حکومتِ برطانیہ ہے؟

وہابیوں پر وفاداری حکومتِ برطانیہ کا بے بنیاد الزام عائد کرنے کے بعد جناب قادری صاحب نے حضرت مولانا محمد حسن بٹالویؒ کو اپنی تحقیق کا بطور خاص تحفہ مشقی بنایا ہے، چنانچہ آپ مذکورہ اقتباس میں قادری صاحب کا یہ ارشاد پڑھ چکے ہیں :-
 ”مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں وہابی کے بجائے لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔“
 اسی طرح انہوں نے اپنے مضمون ”موسمِ احمد خاں اور وہابی تحریک“ میں بھی اس الزام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا :-

”اس سلسلہ میں مولوی محمد حسین بٹالوی کی نمایاں خدمات ہیں۔ انہوں نے ایک رسالہ اشاعت السنۃ خاص اسی مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں کو گورنمنٹ کے قریب تر کر سکیں۔ انہوں نے جہاد کی فوجی پرہیز صرف مضامین لکھے بلکہ مستقل ایک رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھا۔“
 اور اب پھر یہی الزام انہوں نے اپنی تازہ کتاب ”جنگِ آزادی“ میں ان الفاظ میں دوہرایا ہے کہ :-

مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات

لے مقدمہ ”کالاپانی“ ص ۲۹ لے ہفت روزہ چٹان

میں وہابی کے بجائے اہلحدیث لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے
مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی غسوخ پریک
مستقل رسالہ ”الاقتصاد فی المسائل الجہاد“ ۱۲۹۲ھ میں لکھا
ان مذکورہ اقتباسات سے درج ذیل اعتراضات والزامات نمایاں طور واضح ہو
رہے ہیں :-

۱۔ مولانا نے ”اشاعت السنہ“ خاص اس مقصد کے لیے جاری کیا کہ وہابیوں کو گورنمنٹ
کے قریب تر کر سکیں۔

۲۔ مولانا نے وہابی کے بجائے ”اہلحدیث“ لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری
کرائے۔

۳۔ انہوں نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی غسوخ پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ
مستقل ایک رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ لکھا۔

اب ہم انتہائی اختصار کے ساتھ قادری صاحب کہ ان الزامات کا جائزہ لیتے ہیں۔
پہلا اعتراض ”اشاعت السنہ“ کے مقصد اجراء پر ہے اور یہ اتنا بے بنیاد اعتراض ہے
کہ ہم اسے افراء یا کذب محض سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ جو لوگ اشاعت السنہ کے اجراء
کے پس منظر اور ابتدائی پرچوں میں اس کے مدیر کی طرف سے بیان کردہ اعتراض و مقصد
سے آگاہ ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس رسالہ کا مقصد تقلید اور نیچریت کی تردید تھا۔
یہاں ہم خود مولانا بٹالوی کی شہادت پیش نہیں کریں گے کہ شاید وہ قادری صاحب ایم۔ پی۔
کے ہاں معتبر نہ ہوں لہذا ہم یہاں سرسید احمد خاں کی شہادت نقل کرتے ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں

”مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری ہر مہینہ ایک رسالہ نکالتے

ہیں، جس کا نام اشاعت السنہ ہے۔ یہ رسالہ دراصل انہوں نے اپنے چھوٹے

بھائیوں کی خدمت گزاری کے لیے نکالا تھا یعنی اس زمانہ میں جن کو لوگ وہابی

کہتے ہیں۔ دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں ایک وہابی مقلد دوسرے وہابی
 لاذہب یا غیبر مقلد جو اپنے تئیں مدیاہل حدیث کے نام سے
 موسوم ہونا پسند کرتے ہیں اور وہ لوگ جو بدعتی کہلاتے ہیں پہلے فرقہ کو
 پھوٹے بھائی اور دوسرے فرقہ کو بڑے بھائی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں
 اس سے ثابت ہوا کہ مولانا بنا لوی کے اشاعت السنۃ جاری کرنے کا مقصد پہلے
 بھائیوں — مقلدین — کو راہِ راست پر لانا تھا، چنانچہ ابتداء میں یہ رسالہ
 علیہ اور اشاعتِ سنت ہی کے لیے وقف تھا لیکن بعد میں جب سرسید مرحوم اور
 بیت کا چرچا ہوا تو مولانا نے ”اشاعت السنۃ“ کا رخ اس طرف پھردیا۔ یہی وجہ ہے
 کہ ”تذیب الاخلاق“ کی تردید میں شائع ہونے والے رسالوں میں ”اشاعت السنۃ“
 لیا ہے۔ الغرض قادیسی صاحب کا یہ دعویٰ کہ اجراء کا مقصد اہل حدیث کو انگریز
 سے بکرنا تھا، انتہائی بے بنیاد اور بے دلیل ہے اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہو تو
 مانیں۔ ہاتوا برہانکم ان کنتم صادقین !

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے وہابی کے بجائے اہل حدیث لکھ جانے کے
 احکام جاری کرائے۔ گویا مولانا بنا لوی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل حدیث
 کو ایک اور کیا۔ یہ بالکل وہی اعتراض ہے جسے نئے انداز اور نئی تحقیق سے پیش
 کی کوشش کی گئی ہے، جو اس زمانہ میں بعض نیم خواندہ یا غیر متحقق لوگ کیا کرتے ہیں
 اہل حدیث کی ابتداء زیادہ سے زیادہ ایک صدی یا اس سے کچھ اوپر کی ہے۔
 یہ فرقہ کی جدت یا قدامت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے
 جس کی طرف منسوب ہے اس کا تعلق کس زمانہ سے ہے اس مامول کے مطابق
 اہل حدیث کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ اصول اپنی ذاتی شہادت سے بغیر کسی خارجی دلیل

الخلافت پرچہ اول ۱۲۹۶ھ منقول حاشیہ از اشاعت السنۃ ۲ شمارہ ۶ ضمیمہ ص ۱

کی احتیاج کے بابت اہل اعلان کر رہا ہے کہ اہل حدیث اسی وقت سے ہیں جب سے

حدیث مصطفیٰ ہے اور اہل حدیث کا اصل اصول ہی یہ ہے ۔

اصل دیں آمد کلام اللہ معظم داشتن

پس حدیث مصطفیٰ بر جان مسلم داشتن

بحمد اللہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا کوئی عقیدہ، کوئی عمل اور کوئی طریق عبادت ایسا نہیں

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھایا یا ارشاد فرمایا ہو انہو یا کم از کم عبد صحابہ میں اس پر عمل

نہ ہوتا ہو۔ اگر آپ تفصیل کے ساتھ اہل حدیث کی قدامت کے دلائل اور ان کے افکار و

عقائد کی تفصیل جانتا چاہتے ہیں تو ہم امام العصر حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی

رحمۃ اللہ علیہ کی ”تاریخ اہل حدیث“ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب محدث گوہر انوار

رحمۃ اللہ علیہ کی ”تحریر یک آزادی فکر“ کے بغور مطالعہ کی دعوت دیں گے۔ مختصر طور پر صرف یہ

عرض کریں گے کہ برصغیر پاک و ہند کو سب سے پہلے اپنے قدم مہینت لزوم سے نوازنے

والے بزرگ تابعی حضرت ربیع بن صلیح السعدی البصریؒ ہوں یا وہ مقدس قافلہ جس نے

سب سے پہلے فاتحانہ حیثیت میں ساحل ہند پر درود فرمایا یہ سب اہل حدیث تھے۔

یہ اعتراض کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ اہل حدیث کا آغاز کوئی سو اسو سال سے ہوا ہے یا بقول

قادری صاحب مولانا محمد حسین ڈبٹالویؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس نام کو اختیار کیا بلکہ ان

سے اس کے باقاعدہ احکام جاری کر گئے۔

جناب قادری صاحب کا مولانا ڈبٹالویؒ پر تفسیر الاعتراض یہ تھا کہ انہوں نے جہاد

منسوخی پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ کے نام سے ایک کتاب

رسالہ بھی لکھا۔ قادری صاحب کا یہ اعتراض بھی سراسر اتہام اور افتراء ہے جس کا تحقیق

سے دُور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ کتاب کا نام ہی اس الزام کی تردید کر رہا ہے اسے کاش

انہوں نے اس پر غور فرمایا ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قادری صاحب نے شاید یہ کتاب

دلچسپی بلکہ سنی سنائی باتوں پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے یا پھر قادیانی صاحب عربی سے اس قدر ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ”اقتصاد“ اور ”نسخ“ کے فرق کو نہیں سمجھ سکے۔ عربی سے ناواقفیت کے اس شبہ کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اپنی کتاب ”جنگ آزادی“ کے ص ۶۴ پر مولانا کی اس کتاب کا نام ”الاقتصاد فی المسائل الجہاد“ لکھا ہے، جو کہ کتابت کی غلطی منوم نہیں ہوتی بلکہ محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے ”اقتصاد“ اور ”نسخ“ کے فرق کو نہیں سمجھ سکے، شاید اسی طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ ”مسائل الجہاد“ مرکب اضافی یہاں درست ہے یا ”المسائل الجہاد“ مرکب توصیفی!

مولانا ثناء اللہؒ کے رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ کے متن سے تو کیا اس کے پہلے السلطہ ایسی ماسٹیمیں بھی منسوخ جہاد کے متعلق ایک لفظ تک نہیں بلکہ اس رسالہ کا پس منظر اور سبب تصنیف صرف یہ ہے کہ بس دو برس انگریزوں نے مجاہدین کو اپنی ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا رکھا تھا اور برادران احناف بھی اپنے مجاہدین بھائیوں کے بجائے انگریز بہادر کی طرف دست تعاون دراز فرما رہے تھے، تو انہی دنوں مسلمان مجاہدین کے ازلی وابدی دشمن ڈاکٹر ہنزہ نے اپنی رسوائے زمانہ کتاب

لکھی جس نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اپنی صلیبی ذہنیت کے مطابق انجمنی ڈاکٹر ہنزہ نے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں پر بے بنیاد الزامات عائد کیے، اسلام کو چیلنج شدہ آمیز اصولوں کا مجموعہ قرار دیا اور تمام مسلمانوں کی طرح یہی تاثر دیا کہ اسلام بزدل و شمشیر پھیلا ہے نیز اس نے لکھا کہ ایک راستہ عقیدہ مسلمان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی غیر مسلم حکومت کی ماتحتی نہ تسلیم نہ کرے بلکہ انہیں اپنے ملک سے نکال دے یا خود ہجرت کی راہ اختیار کرے۔ ڈاکٹر ہنزہ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلام میں ہر رشتہ میں جہاد فرض ہے ان لیے ہندوستانی مجاہدین بغاوت پر مجبور ہیں الغرض ہنزہ نے اپنی اس کتاب کے باب ”وہابیت“ میں اسلام پر نہایت رکیک نپے کیے اور اہل حدیث کے

خلافت انگریزوں کو بہت اکیسا کیا کیونکہ اس وقت صرف یہی ان کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ مولانا ثناء اللہ نے جب ہینٹر کی کتاب میں ان بے سرو پا اعتراضات کو ملاحظہ فرمایا انہوں نے خالص علمی اور نہایت متین انداز میں ایک ایک کی تردید فرمائی اور نام اس کا ان کی مسائل الجہاد رکھا۔ اپنے اس رسالہ میں مولانا نے کتاب و سنت اور کتب فقہ کے کی روشنی میں اسلام کے نظریہ جہاد کی وضاحت فرمائی اور لکھا کہ جہاد کی فرضیت کے کچھ شرائط ضروری ہیں، جب تک وہ متحقق نہ ہوں، جہاد فرض نہ ہوگا، چنانچہ مولانا جہاد کی غرض و غایت کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ:-

”مذہبی جہاد نہ اس غرض سے مشروع ہے کہ کافروں کو دنیا میں کفر کی نرا دیں اور نہ اس غرض سے ہے کہ ان کو حیرا مسلمان کریں۔ اس جہاد سے غرض جو خدا اور رسول کی کلام سے سمجھ میں آتی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخالفین مذہب کی مخالفت بے با سے بھائیوں اور خدا کے عبادت و جو مخلوق کی پیدائش اور رسولوں کی بعثت سے مقصود خداوندی ہے) کا راستہ صاف کریں اور اس راستہ سے روکنے والوں کو راستہ سے ہٹا دیں۔“

الغرض یہ تھی وہ بات جسے قادری صاحب نے بتنگڑ بنا دیا ہے یہ سعادت تو صرف اسلاف، یوں بند اور ارباب بدایوں و بریلی کے حصہ میں آتی تھی کہ انہوں نے جہاد کی مخالفت انگریزوں کی موافقت میں فرمے دیئے۔ رہے ”وہابی“ یا ”اہل حدیث“ مجاہدین اسلام انہیں ایک طرف برادرانِ یوسف نے تہمت تراشیوں کا ہدف بنا رکھا تھا تو دوسری طرف انگریزوں نے آلام و مصائب کا تھنہ مشق اور یہ عزیمت و استقامت کا پہاڑ بنے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، اہل حق کیساتھ ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؛ کس دن ہمارے سر پر نہ آئے چلا کیے

آخر میں مجھے ایک بات اور بھی عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ ماضی قریب میں ہمیں جن صدات سے دوچار ہونا پڑا ان میں سے امیر المجاہدین حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب بانی دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کا بچن ضلع لاہور اور حضرت مولانا سید ابوبکر غزنویؒ والٹس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا رابگراستے عالم جاودانی ہونا سرفہرست ہے۔

حضرت مولانا صاحب نور اللہ مرحومہ کو تو اللہ تعالیٰ نے جہاد میں علی طور پر شرکت کی سعادت بخشی تھی، وہ اسماعیل شہید کے قافلہ کے آخری سالار تھے۔ ان کا ہر سر ہن موراد خدا میں جہاد کی محبت سے سرشار تھا۔ ان کی مجلس میں جب بہاد کا ذکر آتا تو ان کی بوڑھی رگوں کے خون کی گردش اور سفید بالوں کی چمک دمک تیز ہو جاتی اور اس رخ آتشی کی تب و تاب میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ آہ! اس مرد مجاہد کے وصال سے ہماری صفوں میں کتنا عظیم خلا پیدا ہو گیا۔

آہ! ۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء کی شام بھی کس قدر یاس انگیز تھی، جب کہ لندن کے اُفق پر پاکستان ہی نہیں عالم اسلام کا ایک بے مثل آفتاب غروب ہو گیا تھا، میری مراد حضرت ابوبکر غزنویؒ سے ہے۔ خاندان غزنویہ کے چشم و چراغ، بطل حریت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے تخت جگر اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے والٹس چانسلر حضرت سید ابوبکر غزنویؒ کے متعلق یہ تو سب جانتے ہیں کہ مرحوم پیکر شرافت، مجسم اخلاق اور نہایت منکسر المزاج تھے۔ مرغبانِ مریخ طبیعت کے مالک تھے، جس محفل میں ہوتے کشت زعفران بن جاتی، مزاج کے درویش، دل کے بادشاہ، دماغ کے غنی، زبان کے دھنی، علم و فضل کے پہاڑ، حسنِ عمل کے بحرِ زخار، تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے معلوم ایسا ہو تا کہ احسن الخلقین نے حب الہی، عشقِ رسول، علم و عمل، سوز و گداز اور حسن و جمال سے ایک آئینہ بنایا اور نام اُس کا ابوبکر غزنوی رکھ دیا لیکن شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان تمام اوصافِ حسنہ کے ساتھ

ساتھ آپ کے قلب اطہر میں ولولہ جاد بھی نہایت شدت سے موجزن تھا اور آپ حضرت امیر المومنین صوفی محمد عبداللہ صاحب کی معیت میں تحریک احیائے دین کی تنظیم کے لیے بھی ایسے پناہ ٹرپ رکھتے تھے۔ آپ نے مجاہدیت سرور عبدالقیوم صاحب سابق صدر آزاد کشمیر کے نام ۱۹۶۵ء میں اپنے ایک مکتوب میں اس عزم کا اظہار فرمایا تھا کہ :-

”وقت کا اہم تقاضا ہے کہ حضرت مولانا فضل الہی صاحب کی تحریک

مجاہدین کو منظم اور باضابطہ طور پر از سر نو زندہ کیا جائے۔“

تحریک مجاہدین کے سلسلہ میں مثبت اور نڈھوس لڑیچر کی اشاعت کو بھی آپ نہایت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کے ذمہ بھی انہوں نے دو عنوانات پر کام کرنا لگایا تھا جسے ان شاء اللہ ضرور کیا جائے گا۔ سروسٹ مجھے ان دونوں مقدس شخصیتوں سے محبت رکھنے والوں کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ آئیے

صحیح طور پر ان کے نقش قدم پر چلیں۔

علمی خاکوں میں رنگ بھریں۔

تحریک احیائے دین کو زندہ کریں۔

اور

ذکر و فکر الہی کی مجلسوں کو گرم کریں۔

کتاب کو تصنیف ہوئے چونکہ ایک سو سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اتنے طویل عرصہ میں زبان نے کئی قلابازیاں کھائی ہیں، بے شمار الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو کل رائج تھے لیکن آج متروک ہو چکے ہیں یا ان کی شکل و صورت میں تغیر رونما ہو چکا ہے۔ ایسے الفاظ و محاورات ہمارے جدید قارئین کرام کی طبع نازک پہ بہت گراں گزرتے ہیں۔ لہذا قارئین کرام کی اس مشکل کو برادر عزیز محمد سرور طارق نے اس طرح حل فرمادیا ہے کہ انہوں نے جدید انداز میں اس

کتاب کو مرتب کر دیا ہے، جس سے کتاب کے ابدار گیسوؤں میں پہلے کی نسبت بے پناہ آب و تاب پیدا ہو گئی ہے۔ لہذا وہ ہماری طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے بطور خاص مستحق ہیں۔

برادر عزیز محمد سرور طارق، اپنے پہلو میں ایک درد مند اور حساس دل رکھنے والے صالح نوجوان ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس کم سنی اور نوخیزی کے عالم میں اس بات کے کتنے شدید متسمیٰ ہیں کہ نیکو بے جا میں پھر سے زندگی کی رُوح چھوٹی جائے۔ اسماعیل شہیدؒ کے جلائے ہوئے چراغ کی روشنی کو جلا بخشی جائے اور سر زمین پاکستان میں آئین محمدی کے نفاذ کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو کھپا دیا جائے جبکہ ان کے ہم عمروں کے حاشیہ خیال پر بھی اس قسم کی باتیں نہیں کھٹکتیں۔ پیچ ہے ع

ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات

اس قسم کے صالح جذبات ہی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ”کالا پانی“ جیسی دلولہ آفریں کتاب کی ترتیب و تہذیب کے فرائض انجام دیئے تاکہ قارئین کرام اس سے باسانی استفادہ کر سکیں۔ خدا تعالیٰ ہمارے بھائی کی عمر میں برکت فرمائے ۛ

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

ستاروں پر گنڈ ڈالنے والے ایسے شاہین صفت جوان ہی قوم کا اصل سرمایہ ہیں، ہمیں مستقبل میں ان سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ برادر دم طارق صاحب کی خدمت میں یہ گزارش ہے ۛ

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں

خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!

محمد خالد سیف

۱۲ ربیع الاول ۱۴۹۷ھ

پیش لفظ

انڈیا سے واپسی کے بعد جب ہر دوست نے مجھ سے میری بیس سالہ قید، سفر اور ان جزائر کی کیفیت پوچھنی شروع کی تو میرے لیے ہر ایک کے سامنے بیس سالہ تاریخ کو بیان کرنا نہایت دشوار تھا۔ اس لیے میں نے اس مدت میں پیش آنے والے اہم واقعات کو نہایت اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر دیا ہے تاکہ ہر سائل اور مستفسر کے سامنے اس کتاب کو پیش کر دوں۔

جب اپریل ۱۸۷۹ء میں میں نے تاریخ پورٹ بلیرسٹی "تاریخ عجیب"، لکھی تھی تو اس سے چند دن قبل گورنر جنرل ہند نے میری رہائی کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا، جس سے کم حکام بلکہ خاص و عام کو یقین ہو گیا کہ اب قید فرنگ سے مجھے کبھی نجات نہیں ملے گی لیکن میں حیرت الہی سے ناامید نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے کتاب مذکور کے دیباچہ میں لکھ دیا تھا "دنیا بامید قائم ہے، دیکھئے پردہ غیب سے اور کیا ظاہر ہوتا ہے" بلکہ دیباچہ کے اختتام پر ناظرین کو رام کی خدمت میں التجا بھی کی گئی تھی کہ وہ میرے حق میں دُعا کریں کہ ہماری سرکار اس خاکسار کو ان تنگ و مضطرب جگہوں کی صحبت سے جُدا کر دے تاکہ اس کتاب کی جلد دوم ہندوستان آکر اپنی ملکی زبان میں ہدیہ ناظرین کر سکوں۔

اس دل سوز تحریر کو ابھی چند روز ہونے تھے کہ میری درخواست کے بغیر غیبی مدد سے میری رہائی کا سامان ہو گیا اور لاڈل پرن نے میری رہائی کا اعلان کر دیا۔ میری پہلی کتاب "تاریخ عجیب" کا نام بھی تاریخی ہے اور اتفاق حسنہ کی بات ہے کہ صرف ایک حرف ۱۲۹۲ھ زیادہ کر دینے سے اس کتاب کا نام "تاریخ عجیب"، بھی تاریخی ہو گیا اور اس طرح چھ برس کی زیادتی بھی پوری ہو گئی۔ گویا یہ اس کتاب کی جلد دوم ہے، جس کا وطن واپس آکر لکھنے کا

وعدہ کیا تھا۔

ناظرین باوقار کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے اس کتاب کو روزمرہ کی بول چال میں لکھا ہے اور جہاں تک مجھے یاد تھا دوسرے لوگوں کے مقولوں اور واقعات کو من و من نفل کیا ہے۔ اس کے باوجود اگر تعاضاً نے بشریت کے مطابق مجھ سے کہیں کئی بیشی ہوئی ہو تو خداوند عالم الغیب مجھے معاف فرما دے اور نکتہ چین اصحاب اور اہل قلم جہاں کہیں غلطی لکھیں اپنے قلم غفوسے اصلاح فرمادیں اور میرے حق میں دعا کریں کہ جیسے اس عظیم ہلاکت انگریز قید فرنگ سے نجات بخشی، ایسے ہی وہ رب کریم ولی مراد پوری کروے اور غامہ بالآخر کے ساتھ اس ہلاکت دنیا سے بھی نجات بخشے۔ آمین ثم آمین وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :-

اَحْسِبَ النَّاسَ اَنْ يُّشْرَكَوْا اَنْ
يَقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ
وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ
صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَٰذِبِيْنَ ۝
کیا لوگ یہ خیال کیے ہوئے ہیں کہ (صرف) یہ
کنے سے کہ ہم ایمان لے آئے پھوڑ دیئے
جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے
گی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے
ان کو بھی آزمایا تھا اور ان کو بھی آزمائیں گے،
سو خدا ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے) ایمان
میں سچے اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔

جہاں تک مجھے سمجھ اور علم ہے اس مقدمہ میں ہماری گرفتاری، اس آیت شریفہ میں بیان کردہ منشا از روی کے مطابق صرف سچے اور جھوٹوں کی پہچان اور آزمائش کے لیے تھی ورنہ وعدہ حق موجود ہے کہ "وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَٰذِبِيْنَ ۝" اگر یہ ہماری آزمائش نہ ہوتی تو ہمیں کبھی بھی انگریزی سرکار سے صدمہ نہ پہنچتا اور بغوائے حدیث نبوی :-

يُسَبِّحُ الرَّجُلُ عَلَى حَسْبِ دِينِهِ آدمی کی دین و ایمان کی استعداد کے مطابق آزمائش ہوتی ہے۔

اس مقدمہ میں ایمان کے دعویٰ داروں کی آزمائش کی گئی اور ظاہر کیا گیا ہے کہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے کون تھے اور سچے کون؟ یہ کتاب — تواریخ عجیب المعروف بکلاپانی — گویا اس آیت مذکورہ بالا کی تفسیر ہے۔

اس تمہید کے بعد اب اصل مقدمہ ابتداء سے انتہاء تک بیان کرتا ہوں۔ اگر ناظرین کرام اس آیت مبارکہ اور حدیث شریفہ کے مضمون کو ذہن میں رکھیں گے تو ان پر واقعات کے اسرار و رموز خود بخود آشکارا ہوتے چلے جائیں گے لیکن یاد رکھیے کہ ان کے سمجھنے کے لیے ایمان درکار ہے۔ — میں خود اپنی کم ظرفی، بے استعدادی اور ضعیف الایمانی کے سبب اس مقدمہ کے ہزاروں مخفی اسرار کو سمجھ نہ سکا۔

محمد جعفر تھانیسری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

معرکہ اہلبیلا

۱۸۶۳ء بمطابق ۱۲۸۰ھ کے آخر کی بات ہے کہ مغربی ہند کی سرحد کے قریب انگریزوں کی سرکار کی زبردستی کی وجہ سے ایک عظیم جنگ شروع ہو گئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ اہلبیلے کی گھاٹی میں پہنچ کر سرکاری فوج کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بیگانہ ملک میں سرکار کی بے جا مداخلت کو دیکھ کر علامہ عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آ موجود ہوئے۔ ملکی خواتین اور افغان بھی اپنے بچاؤ کے لیے چاروں طرف سے سرکار پر ٹوٹ پڑے اور مجاہدین کا وہ قافلہ اس کے علاوہ تھا، جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کے لیے چڑھائی کی تھی۔ الغرض بدعویٰ حفاظت خود اختیاری ہر کس و نا کس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجاہدین نے حصول شہادت کے جذبہ سے سرشار ہو کر شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھلائے۔ یہ ہنگامہ جنگ و جدل دیتیں بیٹنے جاری رہا اور تقریباً سات ہزار کشت و خون میں ٹپ گئے، خود جنرل چیمبرلین شدید مجروح ہوئے۔ پنجاب کی تمام چھاؤنیوں کی فوج کو اس جنگ میں جھونک دیا گیا تھا۔

ادھر یہ ہنگامہ برپا تھا اُدھر لارڈ ایلمین و السرائے ہند اپنی اس حرکت پر نادم ہو کر راجپوت ملک عدم ہوا اور ہندوستان بے گورنر ہو گیا۔

ایسے نازک وقت میں ۱۱ دسمبر ۱۸۶۳ء بمطابق ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ کو ایک ولایتی افغان غزن خان نے

سازش کا انکشاف

جو کہ پانی پت ضلع کرنال کی چوکی میں بطور پولیس سوار متعین تھا، کسی ذریعہ سے میرے حالات معلوم کیے اور اپنے دنیوی فائدے کی خاطر ایک لمبی چوڑی اور جھوٹی داستان ڈپٹی کمشنر کرنال کو سنائی اور کہنا کہ سرحد پر ہندوستانی مجاہدین سے لڑی جانے والی جنگ میں، تھانہ میر کاغبر اور محمد جعفر مجاہدین کی روپیہ اور آرمیوں سے مدد کر رہا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ داستان سنی تو بذریعہ تار ضلع انبالہ میں خبر بھیج دی کیونکہ ہمارا تھانہ میر اسی ضلع میں واقع ہے۔

مغرب داستان سرائی کر کے باہر نکلا ہی تھا کہ ہمارے ایک دوست ڈپٹی کمشنر کرنال کی ملاقات کے لیے ان کے ڈیرے پر پہنچ گئے۔ جن سے گفتگو کے دوران ڈپٹی کمشنر نے اس مخبری کا ذکر بھی کیا۔ ملاقات کے بعد جب وہ دوست اپنے ڈیرے پر تشریف لائے تو انہوں نے اپنے ایک نوکر کا دانائی سے جو میرا ہمسایہ تھا بطور انسوس اس واقعہ کا ذکر کیا۔ کاوا اسی وقت مجھے اطلاع دینے کے لیے تھانہ میر دوڑ پڑا۔ جب تھانہ میر پہنچا تو رات کافی بیت چکی تھی۔ سب سے پہلے میرے مکان پر آیا لیکن میں اندر سو رہا تھا۔ اس نے جب دروازہ بند دیکھا تو آرام کے وقت میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور یہ ہو چاکہ صبح کے وقت اطلاع دے دوں گا۔ حقیقت یہ تھی کہ تقدیر اسے دروازے پر سے ہٹالے گئی۔

اب انبالہ کی کیفیت سنئے۔ جب یہ تار انبالہ پہنچا تو میری خانہ تلاشی کے لیے وارنٹ جاری ہوا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کپتان پارسن، پولیس کی ایک بھاری جمعیت کے ساتھ راتوں رات میرے مکان پر پہنچ گیا۔ قدرت الہی کا تماشا دیکھئے! ایک ہی وقت میں دو آدمی روا ہوتے ہیں۔ ایک کرنال سے مجھے خبر دینے کو اور دوسرا انبالہ سے میری خانہ تلاشی کو، کہ نال والا جو میرا خیر خواہ تھا پہلے پہنچا اور کچھ نہ کر سکا۔

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رہو

سوزن تدبیر ساری عمر گر سیتی رہے

دوسرے صاحب رات کے تین بجے میرے گھر پر پہنچ گئے، چاروں طرف سے مکان

بہرہ کرنے کے بعد مجھے باہر بلایا۔ جب باہر نکلا تو دیکھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس، خانہ تلاشی کے انٹ لیو میرے دروازہ پر موجود ہے۔ اُس نے وارنٹ دکھائے اور کہا کہ مکان کی تلاشی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے سوچا کہ تلاشی پہلے گھر کے اندر کی ہو بہتر ہے تاکہ بیٹھک میں رکھا ہوا خطر پولیس کے ہاتھ نہ لگے لیکن جو ہونا ہے اسے کون روک سکتا ہے؟ باوجودیکہ صدر دروازہ کی اندرونی دہلیز میں بالکل اندھیرا تھا اور بیٹھک کا دروازہ شمالی جانب تھا، بالکل نظر نہیں آتا تھا، لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب اسی پر مصر ہوئے کہ پہلے یہاں ہی کی تلاشی لی جائے۔

بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے دو دروازوں کا کھٹانا ضروری تھا، جو کہ اندر سے بند ہیں۔ میں نے چالاکانہ منشی عبدالغفور کا نام (جو اس کے اندر چند آدمیوں کے ہمراہ موجود تھے) کو بلند آواز سے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے لیے کھڑے ہیں، تم جلد دروازہ کھول دو۔ اس سے میری غرض یہ تھی کہ کسی طرح وہ لوگ تلاشی کی بات سمجھ کر، دروازہ کھولنے سے اس زہریلے خط کو چاک کر دیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے میری پکار کو سمجھتے ہوئے مجھے روکا لیکن میں مل نہ سکتا تھا۔ بیٹھک کے اندر والے گہرا ہٹ میں میرے اشاروں کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ اب بیٹھک میں تلاشی ہونے لگی تو جس خط کا ڈر تھا، سب سے پہلے وہی پتھر کے ہاتھ لگا۔ اسی شام کو پکڑے جانے سے چھ گھنٹے پہلے تقدیر نے وہ خط میرے ہاتھ سے اٹھ کر رکھا تھا، خط امیر قافلہ کے نام تھا اور اس میں اصطلاحی لفظوں میں چند ہزار اشرفیوں کی رقم کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ چند خطوط پارینہ بھی پولیس کے ہاتھ لگ گئے، جو کہ محمد شفیع انبلاوی پٹنہ سے ارسال کیے تھے، اگرچہ ان خطوط میں کوئی مضر بات نہ تھی مگر ان سے پولیس کو شیخ انبلاوی اور اہل پٹنہ مثلاً مولانا کبیر علی، مولانا عبدالرحیم اور مولانا احمد اللہ وغیرہ (جو اس وقت تحریک مجاہدین کے اربابِ صل و عقد تھے) کی تلاشی و تفتیش کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

منشی عبدالغفور جو کہ بہار کے ضلع گیا کے باشندے تھے اور میرے پاس محرری کا کام

کیا کرتے تھے اور ایک لڑکے عباس نامی کو، جو بیچک میں سویا ہوا تھا، پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اگرچہ میری نسبت انہیں قوی شک ہو گیا تھا لیکن وارنٹ گرفتاری اور گورنمنٹ کی منظوری کے نہ ہونے کی وجہ سے جو کہ ایسے مقدمات میں ضروری ہے، پولیس نے مجھ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ پولیس کی واپسی کے بعد، یہ بات غور طلب تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ میں

فرار

نے اس خیال سے کہ چونکہ میرے گھر سے ثبوت مل گیا ہے اور جنگ سرحد کی وجہ سے حکومت کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے فرار ہو جانا اور بزدلی سے جان بچانا مناسب سمجھا، اگرچہ میں پولیس کی حراست میں نہیں تھا مگر وہ چاروں طرف سے میرا سراغ لگاتے ہوئے، میری حرکات کو تاک رہے تھے۔

میں نے اپنی والدہ ماجدہ جو کہ اس وقت بعقید ریات تھیں اور اپنی بیوی سے صلاح مشورہ اور انہیں اپنے فرار پر راضی کر کے یہ داؤ کھیلنا کہ میں ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء کو اپنے شہر سے روانہ ہو کر اول موضع پٹیلی میں، جہاں تحصیل اور تھانہ وغیرہ ہے، آیا اور تحصیل اور پولیس کے ملازمین سے بھی رائے لی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ سب نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ تم انبالہ جاؤ اور وہاں سے دریافت کرو یہ کیا مقدمہ ہے اور کس نے یہ تجبیری کی ہے؟

یہ سب صلاح مشورہ کرنے کے بعد میں بوقت شام براستہ سڑک کلاں پٹیلی سے بظاہر انبالہ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت بہت سے آدمی شہیم محبت اور افسوس سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جب میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلا تو ہر کسی کو یقین ہو گیا کہ میں انبالہ جا رہا ہوں۔ جب تک دن کی روشنی رہی میں برابر سڑک پر انبالہ کی طرف چلتا رہا۔ کوئی میل بھر راستہ چلنے کے بعد جب خوب تاریکی پھیل گئی اور مسافر بھی دُور دُور تک نظر نہ آتے تھے، تو میں نے سڑک کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور تھانہ کے متصل اپنی زمین میں مقررہ جگہ پر ایک سبے رات پہنچ گیا۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ، بیوی، بچے اور بھائی محمد سعید میری آخری ملاقات کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔ والدہ سے آخری ملاقات کر کے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ایک

عمر بہیلی پر سوار ہوئے اور تین میل کا فاصلہ طے کر کے صبح پانی پیت پہنچ گئے۔ نئی شہر کے اندر گیا بلکہ شہرک ہی سے بیوی بچوں کو رخصت کر دیا۔ اس وقت میں جس سے بھی رخصت ہوتا تھا، زندگی میں دوبارہ ملنے کی امید نہ تھی۔ بہیلی والے سے میں نے کہا کہ میرے بیوی بچوں کو پانی پیت میں چھوڑ کر تم بہیلی لے کر جتنا پار چلے جانا۔ یہ بہیلی مع بیویوں کی جوڑی، جو تین سو روپیہ سے کم قیمت کے نہیں ہیں، ہم نے تین اس شرط پر بخش دی کہ کسی کو میرے بال بچوں کی خبر نہ دینا اور جب تک یہ معرکہ گرم رہے تھا میرے نہ جانا۔ جس وقت ڈاک خانہ پانی پیت کے سامنے میں ساری عمر کے لیے اپنے بیوی بچوں سے جدا ہوا اور میرا بیکہ ان کے سامنے دہلی کو چلا، وہ عادتہ ناقابل بیان ہے۔ آج بھی وہ ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے اور شب و روز گریزوں کے باوجود میں اسے بھول نہ سکا۔

انامک کے ذریعہ چالیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد، دوسرے دن دہلی پہنچ گیا اور دہلی

وہاں میاں نصیر الدین کی کوٹھی میں قیام کیا۔ میاں حسینی ساکن تھانیر، حسینی ساکن بیٹا اور عبداللہ نامی ایک بنگالی سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں مؤخر الذکر ٹپنہ سے کچھ اشرفیاں لے کر، اسی دن آئے تھے۔ میں نے وہ اشرفیاں ان سے لے کر حسینی ساکن تھانیر کے حوالہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کر دی کہ جیسے ممکن ہو اس بیت المال کو قافلہ تک پہنچا دو۔

حسینی تھانیر کو روانہ کرنے کے بعد، میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ پورب لے جانا بااکیہ کو معرکہ اہلیلا اور میرے مکان کی تلاشی کے بعد پنجاب میں امن نہیں رہا تھا۔ اس وقت میں نے عمر کی ابھی تک صرف پچیس بہاریں دیکھی تھیں لہذا اس شباب کے زمانہ میں نہ ہی جوش جنون کی حد تک تھا اور زمانہ کے نشیب و فراز کا کچھ خیال نہ تھا۔ بس ایک لگن تھی کہ یہ خدا کا کام ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میری تلاشی انبالہ اور اس کے مغرب میں ہو رہی ہوگی، اس طرف میری تلاش میں کون آئے گا؟

اس مذکورہ خیال کے باعث دہلی پہنچ کر، میں نے اپنے تئیں مخفی رکھنے کو ضروری

علی گڑھ

نہ بھجا۔ اس لیے آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔ ایک دفعہ اپنے معمولی لباس میں چاندنی چوک تک بھی گیا تاکہ سواری کے لیے کرایہ کی شکرم وغیرہ کا انتظام کیا جاسکے۔ ۱۵ دسمبر کو چھ بتوں کھلم کھلا شکرم پر سوار ہو کر علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں گاڑی بان کو بہت سا انعام و اکرام دے کر چاہا کہ جس قدر ممکن ہو علی گڑھ جلد پہنچ کر ریل پر سوار ہو جائیں۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ جس چال سے آیا ہوں، شاید کوئی مدت تک بھی میری تلاش کو ادھر نہ آئے۔ میں اپنی تہیہ پر اتنا نازاں تھا کہ تقدیر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اب مجھے یہیں تھپوڑیئے اور پولیس انسبڈ کی کارروائی سنئے!

۱۲ دسمبر کو جب پرنٹنگ پریس میرے خطوط اور ان آدمیوں کو جو میرے گھر سے ملے تھے، انہالہ لے گیا تو ان کو دیکھ کر گورنمنٹ نے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے، وہی پرنٹنگ پریس جب میرے وارنٹ گرفتاری لے کر دو سکر دن تھا نیرسرایا، تو اس نے مجھے وہاں نہ پا کر شہر میں آفت مچا دی، سینکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی، پچاسوں مرد و عورت پکڑے گئے، بوڑھی والدہ، بھائی محمد سعید — جو اس وقت صرف بارہ تیرہ برس کا تھا — اور اس کی بیوی کو قید کر کے ان پر سخت تشدد اور مار پٹائی شروع کر دی گئی۔ پردہ نشین عورتوں کو اس قدر آلام و مصائب کا تجربہ نہیں بنا یا گیا کہ سن کر دل لرز اٹھتا اور کانپ کانپ جاتا تھا۔ میری بیوی کی گرفتاری کے لیے پولیس کی ایک جمعیت پانی پتہ دوڑی، مگر مولانا عتیلاظم صاحب کی جواہر والدہ کی دلیری سے میری بیوی بچ گئی۔ اُن ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والوں میں سے میرا بھائی محمد سعید جو کہ نہایت کم سن، لذت ایامی سے نا آشنا اور فضائل ثابت قدمی سے سراسر بے بہرہ تھا، اس سخت مار پیٹ کی تاب نہ لاسکا، ڈر گیا اور جان بچانے کے لیے بول اٹھا کہ میرا بھائی دہلی گیا ہے۔ یہ خود میری غلطی تھی کہ ایسے اہم راز پر ایک نابالغ بچے کو آگاہ کر دیا تھا، جس کا نتیجہ میری گرفتاری کی شکل میں برآمد ہوا۔ جب میرے بھائی نے راز کا انکشاف کر دیا تو پکار سے لے کر گاڑی کے ذریعہ دہلی پہنچ گیا۔

اور پنجاب میں جا بجا میری تلاشی شروع ہو گئی تھی کہ میری گرفتاری کے لیے دس ہزار روپیہ کا انعامی اشتہار جاری ہوا۔ انبالہ کیپ میں محمد شفیع کے مکان کی بھی تلاشی ہوئی، اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھے بلکہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ ان کے بھائی محمد رفیع اور ان کے کارندے مولانا محمد تقی اور منشی عبدالکیم وہاں موجود تھے لہذا ان کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈرایا گیا کہ اگر تم صورت حال سے آگاہ نہیں کرو گے، تو ہمیں تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ جان کے فخر سے محمد رفیع اور محمد تقی نے محمد شفیع کے خلاف شہادت دے دی اور پولیس کے کہنے کے مطابق گوہری دے لپانی جان بچائی۔ منشی عبدالغفور نے شہادت نہ دی لہذا انہیں بلا قصور محمد شفیع کے ساتھ جیل قید کر دیا گیا۔

پارسن صاحب دہلی پہنچے تو انہوں نے یہاں بھی آنت مچا دی، سرائوں اور شہر کے دروازے بند کر دیئے، ہزاروں آدمیوں کی تلاشی ہوئی، پچاسوں آدمی پکڑے گئے، اسی پکڑ وھکڑ میں پارسن کو یہ علم ہو گیا کہ میں فلاں شکرم میں سوار ہو کر فلاں وقت دودو سرے آدمیوں کے ہمراہ علی گڑھ کی طرف روانہ ہوا ہوں، انہوں نے اسی وقت تار برقی کے ذریعہ علی گڑھ میری گرفتاری کے لیے خبر کر دی۔

علی گڑھ میں گرفتاری

علی گڑھ میرے گھر سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو اسی وقت تار پہنچ گیا۔ لہذا اسی وقت ریل پر سڑک پولیس نے آکر ہمیں گھیر لیا اور ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ کے بنگلہ پر بلے گئے، اس نے ہمیں مجسٹریٹ صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جہاں مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو تدارک کے جواب ثانی آنے تک حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اسی دن شام کو جب میں تدم کر کے نماز پڑھ رہا تھا، پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے اور مجھے قید میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ "اس کو پھانسی گھر میں نہایت حفاظت کے ساتھ بند کر دو۔" حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور مجھے ایک بڑی تنگ و تاریک اور کال کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور گرد و دو تین سپردار

مقتین کر دیئے گئے۔

پہانسی گھر میں بند ہو کر مجھے عقل آئی لاس فرار اور تدبیر پر فخر خداوند تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تھا۔ اس فرار سے یہ مقدمہ بہت بھاری ہو گیا اور پھر مجھے یا میرے عزیزوں اور دوستوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، وہ اسی فرارنا بکار کا ثمرہ تھا۔ آزمائش کے وقت بھاگ جانا پتے عاشقوں کا کام نہیں ہوتا۔ بقول حافظؒ سے

بیگانہ را چہ کار بود در بلائے غم
آرزو رسد کہ خاص بود آشنائے ما

علی گڑھ کے پھانسی گھر میں قید تھا کہ ایک رات پہرے دار پر چھنے لگے ”پہانسی والے مجرم پر بھی موت ایک پہرہ ہوتا ہے، تم ایسا کیا قصور کر کے آئے ہو کہ جس سے تم پر تین پہرے لگائے گئے ہیں“ میں نے جواب دیا ”میں جس آقا کا غلام تھا، اس کے حکم کے بغیر بھاگ نکلا لہذا وہ ناراض ہو گیا اور مجھے راستہ ہی سے پکڑوا دیا۔“

جیل میں ناقص خوراک | جیل کا کھانا سب سے پہلے اسی خیل میں چکھا، جو دو روٹیوں اور تھوڑے سے ساگ پر مشتمل تھا۔ ساگ میں موٹے موٹے

ڈنٹھل تھے، پتی کا نام تک نہ تھا۔ اس لیے ان کا چبانا بھی دشوار تھا۔ روٹیوں میں جو تھائی کے قریب ریت اور مٹی ملی ہوئی تھی۔ خدا کا شکر ادا کر کے اس میں سے تھوڑا بہت کھایا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً اکثر جیل خانوں میں رہ کر دیکھا، سب جگہ قیدیوں کو اسی طرح کا کھانا ملتا تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ قیدیوں کو خوراک کم ملتی ہے، جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ جب انہیں گندم پیسنے کے لیے دی جاتی ہے، تو وہ بھوک کے مارے سروں گندم چبا جاتے ہیں یا کپتا آٹا پانی میں گھول کر پی لیتے ہیں اور آٹے کا وزن پورا کرنے کے لیے آٹے میں مٹی یا ریت ملا دیتے ہیں اسی طرح جو عمدہ ترکاری جیل کے باغوں میں پیدا ہوتی ہے، اس کو تو فروخت کر دیتے ہیں یا جیل کے عہدہ دار کھا جاتے ہیں اور ناکارے ڈنٹھل جن کو جانور بھی نہیں کھاتے، کاٹ

کاٹ کر قیدیوں کے لیے پکا دیئے جاتے ہیں۔ وہ بھوکے اسی کو غنیمت جان کر ہاتھوں ہاتھ اڑا جاتے ہیں، اگرچہ نئے قیدیوں کو ایک دو دن ضرور دقت ہوتی ہے، مگر جب بھوک سے پیٹ میں قراقرٹ اٹھتے ہیں تو پلاؤ قورے سے بھی زیادہ اس میں مزہ پاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں کیونکہ دنیا میں اصل مزہ بھوک کا ہے۔

امتحانِ عشق | دوسرے دن پارسن صاحب خوشی خوشی ہم تینوں آدمیوں کو لے کر بذریعہ شکرم دہلی روانہ ہوا۔ شکرم میں سوار ہونے سے پہلے مجھے بڑی ہتھکڑی اور طوق پہنا کر اور طوق میں بطور باگ ڈور ایک زنجیر ڈال کر اور اس کا سرا ایک مسلح سپاہی کے ہاتھوں میں دے کر اس کو میرے پیچھے بٹھایا۔ پارسن صاحب اور دوسرا ایک پولیس میرے دائیں بائیں بھرے ہوئے تپخوں کی جوڑیاں لے کر اور میرے بدن سے بدن ملا کر بیٹھ گئے۔ راستہ میں پارسن مجھے بار بار کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی، تو میں اس تپخے سے تمہیں مار ڈالوں گا۔

علی گڑھ سے دہلی تک کھانا پینا تو درکنار، کسی سخت ضروری حاجت کے لیے بھی ہمیں نہ اتارایا۔ جب نماز کا وقت آتا، تو میں اجازت کے بغیر ہی تیمم کر کے بیٹھے بیٹھے اسٹروں سے نماز پڑھ لیتا تھا۔ گاڑی بدستور سوتے منزل رواں دواں رہتی اور وہ چپ چاپ میری نماز کا تماشا دیکھ کرتے تھے۔ آخر کار بڑی مصیبت کے ساتھ، نوپے میں جکڑے ہوئے، دہلی میں داخل ہوئے، جہاں ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس دہلی کے بنگلہ کے ایک تہ خانہ میں ہمیں زندہ درگور کر دیا گیا۔

دہلی سے انبالہ تک | دوسرے دن ہمیں دہلی سے کرنال اور کرنال سے انبالہ لے گئے۔ جب انبالہ پہنچے تو رات بھیگ چکی تھی۔ ہمیں بے آب و دان تین علیحدہ علیحدہ پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا، پناہ خانہ ہم پر ریل کے شہر وں تک یہیں بند رہے۔

دوسرے دن فجر کے وقت سیزنڈنٹ پارسن، میجر رام فیلڈ ڈپٹی انسپیکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹائی ڈپٹی کمشنر انبالہ یا جوج ماجوج کی طرح میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سبب حال بنا دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ پارسن نے پہلے تو مجھے بہت ڈرایا دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب مارا اتنا کوہنچ گئی تو میں گر پڑا۔ ٹائی صاحب اور جام فیلڈ کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہو گئے۔ جب اس قدر تشدد پر بھی میں نے کچھ نہ بتایا، تو وہ سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ جب میں نے ظلم و تعدی کی یہ کیفیت دیکھی، تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ رمضان المبارک کے کچھ روزے باقی تھے، دوسرے دن سے میں نے ان کی قصاص لکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن میں روزے سے تھا، علی الصبح پارسن صاحب آیا اور وہی کارروائی شروع کر دی۔ تھوڑی زد و کوب کے بعد مجھے اپنی گتھی میں بٹھا کر ڈپٹی کمشنر ٹائی صاحب کے بنگلے پر لے گیا، جہاں ٹائی اور جام فیلڈ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے بڑی چالوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکار اور معاونین جہاد کے نام بتاؤ تو تمہیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور ایک بڑے عہدے پر بھی فائز کر دیں گے۔ بصورتِ غیر تمہیں پچاسی کی سزا دی جائے گی۔ میں نے اس چالوسی پر بھی انکار کر دیا۔

پھر پارسن صاحب ان دونوں سے انگریزی میں کچھ باتیں کر کے، مجھے ایک الگ کمرے میں لے گیا اور وہاں پھر مارنا شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضلِ الہی میں نے سب کچھ برداشت کر لیا اور ہر دم اپنے رب سے دعا کی ”اے رب ذوالجلال! یہ استہزاء کا وقت ہے، تو مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرما۔“ جب وہ ہر طرح مایوس ہو گئے تو لاچار ہو کر انہوں نے آٹھ بجے رات مجھے واپس جیل خانہ میں بھیج دیا۔

میں تمام دن روزے سے تھا، بنگلہ سے باہر نکل کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار

کر لیا۔ جیل میں پہنچ کر جو میرے حصہ کا کھانا رکھا ہوا تھا کھایا اور سکرالٹی بجا کے سو گیا۔

جس دن ٹائی صاحب کے بنگلہ پر مار پیٹ کی لذت اٹھا رہا تھا، اس وقت منشی حمید علی صاحب تھان پوری تحصیلہ ارنرائن گڑھ اپنے عہدہ سے معطل ہو کر باہر برآمدہ میں نگین بیٹھا تھا۔ اس کا تصور یہ تھا کہ اس نے چند برس پہلے، اپنے کسی دنیاوی معاملہ میں مجھے ایک خط لکھا تھا اور کچری کے بعض عملہ نے، اس سے دشمنی کی بنا پر، اس کے معنی غلط بیان کر دیئے تھے۔ میں اس کا نگین چہرہ دیکھ کر اپنی تکلیف بھول گیا اور دل میں خیال آیا کہ مجھ منحوس اور نالائق کو ایک خط لکھنے کی وجہ سے یہ بے چارہ بے گناہ پکڑا گیا۔ اگر اس کے بجائے مجھے ہی سزا ہو جائے اور یہ رہا ہو جائے تو یہ بہت بہتر ہے۔ میں اپنی حالت زار کے باوجود اس کے لیے بہت دعائیں کرتا ہوں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ ناکر وہ گناہ بری ہو کر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اب تک پنجاب میں اول درجہ کا عہدہ دار ہے۔ اس دن کے بعد کچھ کچھ مجھے سرکاری گواہ بننے کی ترغیب نہیں دی گئی۔

جب میری طرف سے قطعی مایوسی ہو گئی تو محمد رفیع اور مولوی محمد تقی کو مخبر بنا کر رہا کر دیا گیا۔ انہیں کے بیان سے بے چارہ محمد شفیع لاہور سے پکڑا گیا تھا، جس کا اس مقدمہ سے بہت ہی تھوڑا تعلق تھا۔ پھر انہی کی رہبری میں پارس پٹنہ گیا تھا، جہاں ایشرمی پر شاد ملازم پولیس اور مسٹر ٹیلر سابق کمشنر پٹنہ — جسے ۱۸۵۷ء میں مولانا احمد اللہ صاحب دغیرہ موجدوں کو بے قصور نظر بنانے کے قصور میں برخواست کر دیا گیا تھا — اس کے نہ دکا ہو گئے، ان کی غیبت سے اس نے مولانا کچی علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب، الہی بخش اور میاں عبدالغفار کو گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا۔

پھر پارس بنگال گیا، جہاں اس نے جا بجا بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا، ان میں سے اکثر نوکروں، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے رہا ہو گئے اور بہت سے لوگوں کو بچانسی دینے کی دھمکیاں دے کر گواہ بنالیا گیا۔ صرف ایک قاضی میاں جان ساکن کار کھلی ثابت قدم رہے، جو گرفتار ہو کر انبالہ

آئے۔ بعد ازاں، علاؤ الدین سوداگرانِ دہلی اور دوسرے بہت سے لوگ دہلی سے بھی گرفتار ہو کر آئے۔ پشاور سے بنگال کے مشرقی و شمالی کنارہ تک شاید کوئی مالدار مسلمان، مولوی یا نازی بچا ہو، جسے ایک دفعہ پولیس نے پکڑ کر، اس کی طاقت کے مطابق اپنی مٹھی گرم نہ کر لی ہو۔ یہ ہنگامہ دار و گیر دسمبر سے اپریل تک جاری رہا اور صد ہا آدمیوں کو ڈرا، دھمکا اور سلکھا کر گواہ بنایا گیا۔

اس پارس گردی کے زمانہ میں وہ بے چارہ سینی تھاغیر سی بھی دہلی سے اشرفیاں لاتے ہوئے پکڑا گیا اور کل اشرفیاں ضبط کر کے ہمارے ساتھ ہی بے قصور قید ہوا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اس مقدمہ میں بڑے بڑے صاحبِ دلوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آئین

غداروں پر نوازشیں

اور قانون کو طاقِ نسیان کر دیا مثلاً اشرفی پر شاد وغیرہ نے اپنے فائدے کے لیے اس مقدمہ کو رستی سے سانپ اور رانی سے پہاڑ بنا دیا اور ہمیں نیولین یا مہدی سوٹو افی جیسا انگریز کا دشمن ثابت کر کے اپنا مطلب نکالنا چاہا؛ چنانچہ اسے کامیابی ہوئی اور وہ ایک ادنیٰ عہدے سے چوٹی تکڑ ہو گیا نیز دھوکہ دے کر سکرار سے بڑی بڑی زمینداری اور جاگیر بھی حاصل کر لی۔ اسی طرح غزن خان نے اپنے بیٹے کے قافلہ کے بھیجنے کا ایک جھوٹا اور فرضی قطعہ کھڑ کر حکومت سے ایک دو گاؤں جاگیر لے لیے۔

۱۸۶۳ء کے اخیر سے لے کر دس برس تک ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رہی۔ مسلمان خوف کے بارے میں گھبراہٹ چھوڑ کر عرب ملکات میں ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ غرض خوشامدیوں اور ہمارے دشمنوں نے دل کھول کر ارمان پورے کیے۔ دس برس تک اخباروں میں یہی قصہ موضوعِ سخن بنا رہا۔ برسوں تک اس دار و گیر کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ موجود رہا جس کا کام ہی یہ تھا کہ جس کو چاہا پکڑ لیا، جو چاہا رشوت لے لی اور جس نے رشوت دینے سے انکار کر دیا، اپنے معمولی گواہوں سے گواہی دلا کر اسے عرق قید کر دیا۔

شیخ الكل میاں نذیر حسین کی طلبی

چیمبرلین صاحب دہائیوں کی اس دار و گیر کے سلسلہ میں کشتہ مقرر ہوئے تھے اور راولپنڈی

ان کا صدر مقام تھا۔ انہوں نے دہائیوں کی حمایت کے جرم میں شیخ الكل حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی کو بھی دہلی سے راولپنڈی طلب کیا۔ ابھی کچھ کارروائی شروع نہ ہوئی تھی کہ احکم الحاکمین اور سربراہ الامتعام کو اپنے برگزیدہ بندوں پر ظلم کی یہ کارروائی پسند نہ آئی اور اس نے چیمبرلین صاحب کی موت ناگہانی کے وارنٹ جاری کر کے اسے اپنے دربار عالی میں طلب کر لیا۔ اس کی موت کے بعد کچھ کسی کو اس خطرناک خدمت کے قبول کرنے کا موصلا نہ ہوا، وہ محکمہ ہی ٹوٹ گیا اور غریب مسلمان اس غیبی تائید کے ساتھ اس آفت ناگہانی سے محفوظ ہو گئے۔ حضرت میاں صاحب محدث دہلوی جنہیں ہندوستان کے تمام اہل حدیث ممبروں کے نام ظاہر کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا، رہا ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔

خود غرض لوگوں نے ہماری بہادر اور دانا سرکار کے دل پر، ان سود و سو فقیروں کا ڈر اور رعب

ہمارے ہندوستانی مسلمان

اس قدر جمایا اور اس میں ایسا مبالغہ کیا کہ گویا انگریزی سلطنت کا قلع قمع کرنے والے ہیں لوگ ہیں اور اس کا اثر جس قدر ہماری فاتح قوم پر ہوا ہے، وہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "OUR

INDIAN MUSALMANS کے دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں کیسے رسی کا

سانپ اور رائی کا پہاڑ بنایا گیا ہے اور کن کن دلائل سے فاتح اور مغتوح قوم کے درمیان

عداوت ثابت کی گئی ہے اور پھر طرہ یہ کہ علی العموم ہندوستان کے تمام مسلمانوں پر حملہ کیا گیا،

حالانکہ اس تحریر کے بعد بڑے بڑے موقوف پر خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات پیدا

ہوئے لہذا فاتح اور مغتوح کے دلوں کو بگاڑنے والی یہ کتاب ہرگز قابل اعتبار نہیں ہے۔

جب یہ کتاب چھپ کر آئی، اسی وقت مولوی سید احمد صاحب بہادر سی۔ ایس۔

آئی نے بڑے دلائل سے اس خیالی پلاؤ ڈاکٹر کی تردید کر کے اس کی دھجیاں اڑا دیں اور

ہر دعویٰ کو اصول ہی سے غلط ثابت کر دکھایا لیکن وہابیوں کو اپنا جانی دشمن سمجھنے والے انگریزوں پر ابھی تک اس کتاب کا جادو اثر باقی ہے۔ اگرچہ افغانوں نے پنجاب میں عسکری کے ابتدا ہی میں صد ہا بڑے بڑے معزز انگریزوں، میم اور بچوں حتیٰ کہ گورنر جنرل تک کو مار ڈالا۔ اب بھی جہاں موقع پاتے ہیں، اپنی وحشیانہ حرکت سے باز نہیں آتے۔ ان کے مولویوں نے بھی فتوے دے رکھا ہے کہ انگریزوں کا مارنا بڑا ثواب ہے لیکن اس کے باوجود انگریز افغانوں کو اپنا اس قدر دشمن نہیں سمجھتے، جتنا کہ وہابیوں کو، ڈاکٹر ہنٹر کے پھیلائے ہوئے تعصب کے باعث انہوں نے اپنا دشمن فرض کر رکھا ہے حالانکہ وہابیوں سے کسی انگریز کا قتل تو کجا، کبھی خلافت تہذیب بات بھی سرزد نہیں ہوئی۔

۱۸۵۷ء میں جب کہ بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کی حفاظت کی، انہیں اپنے گھر میں چھپایا اور باغیوں سے محفوظ رکھا مگر ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کی وجہ

سہ سرسید احمد خاں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ”OUR INDIAN MUSALMANS“ پر

”REVIEW ON DR. HUNTER'S INDIAN MUSALMANS“ کے نام سے

نہایت تفصیل سے تبصرہ کیا تھا جو مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوا تھا، کئی مرتبہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اقبال اکیڈمی لاہور کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔

۱۱ مولانا تھانیسری کا یہ اشارہ حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد زید حسین محدث دہلویؒ کے اس واقعہ کی طرف ہے کہ آپ نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے موقع پر ایک انگریز میم سر لینس کو پناہ دی تھی۔

اہل حدیث اور حضرت میاں صاحبؒ سے عناد رکھنے والے بعض لوگ اس واقعہ سے استدلال کرتے

ہوئے انگریز فوازی کا الزام لگایا کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں واقعہ کی اصلیت سے آگاہ کر دینا بجا

نہ ہوگا۔ حضرت میاں صاحبؒ کا اس انگریز عورت کو پناہ دینا آپ کی عظمت شان کا ایک تین شہرت

ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے یہی آپ کے شایان شان تھا

قرآن مجید، احادیث نبوی اور فقہ کی رو سے حالت جنگ میں کافر قوم کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں

سے دونوں قوموں کے درمیان تعصب، نفرت اور دشمنی بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن خدا کا شک ہے کہ ان گزشتہ پچیس برس کے تجربوں اور وہابیوں کی خیر خواہی سنے ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی دروغ گوئی کو طشت از بام کر دیا ہے؛ چنانچہ گورنمنٹ ہند کے حکم سے سرکاری تحریرات میں ان کے لیے لاپانی کے لفظ کا استعمال ایک قلم بند ہو گیا ہے اور آئندہ سے یہ لوگ اپنے پرانے نام محمدی یا اہل حدیث سے پکارے جائیں گے۔ گورنمنٹ کا یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ اس وجہ سے اگر کبھی مرقع آپڑے تو سرکار پر اپنی جان بچاؤ کرنے سے بھی یہ لوگ دریغ نہ کریں۔

موت قتل کرنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے:- **وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِدْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ** (التوبہ آیت ۶) ترجمہ یہ ہے کہ ”اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے وناک اشد کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ وہ جانتے نہیں“ پس حضرت میاں صاحب نے ایک زخمی انگریز عورت کو مرث اس لیے پناہ دی کہ خدا و رسول کا حکم ہی تھا۔ یہ قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے مطابق عمل کرنے کا وقت تھا جو زندگی میں شاید کبھی میسر نہ آتا۔ بلوائیوں کے شرور قبضہ کے باعث اگرچہ آپ کو مشکلات کا علم تھا لیکن خدا و رسول کو خوش کرنے کا بھی یہی فتوہ تھا؛ چنانچہ آپ نے ایک ایک لفظ پر عمل کر دکھایا۔ عورت کو پناہ دی، زخمی تھی اس کا علاج کیا، اللہ کا کلام سنایا اور پھر اسے اس کی قوم میں پہنچا دیا جو کہ اس کا ”مأمّن“ تھا۔

اے یہاں بھی اہل حدیث پر انگریز دوستی کا الزام لگانے والوں کے لیے غلطی میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے (بلکہ بعض لکھے پڑھے دوست غلطی میں مبتلا ہو گئے)، اس لیے ان سطور کے پس منظر کو میان کر دینا ضروری ہے۔ مولانا محمد میسر نے سوانح احمدی یا اپنی کتاب ”کالا لاپانی“ اس وقت تحریر فرمائی جب انگریز اہل حدیث کی مخالفت میں جنوں کی حد تک پہنچ چکا تھا اور تحریک جہاد انتہائی مقہور تھی حتیٰ کہ مجاہد کو دار و رسن اور قید و بند کی ایسی ایسی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا جن کے تصور ہی سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریز کی کوشش تھی کہ تحریک کو کپکپ کر مجاہدین کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے

مقدمہ انبالہ

دسمبر سے اپریل تک داروگیر کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اپریل میں یہ مقدمہ ضلع انبالہ کے مجسٹریٹ کے پاس پیش ہوا۔ ہم سب لوگوں کو پچاسی گھروں سے نکال کر کچہری میں لے جایا گیا۔ کچہری میں جا کر معلوم ہوا کہ پچاسی کی دھکی دے کر میرے بھائی محمد سعید کو میرے اوپر اور محمد شفیع کے حقیقی بھائی محمد رفیع کو اس پر گواہ بنالیا گیا ہے نیز پچاس ساٹھ دیگر آدمیوں کو بھی زبردستی گواہ بنالیا گیا ہے۔ ان بے چاروں کی عجیب حالت تھی ایک طرف گواہی دے رہے تھے اور دوسری طرف ہماری جانب دیکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ یہ بے بس اور مجبور محض تھے کیونکہ اگر گواہ نہ بنتے تو تختہ دار پر لٹکا دیئے جاتے۔ اداائے شہادت تک ان بے گناہوں کو قیدیوں کی طرح پولیس کے زیرِ حراست رکھا گیا۔ لباس اور غراک کا انتظام سرکاری تھا، جس کی وجہ سے ان بے جا کارروائیوں پر حکومت کالا کھوں روپیہ صرف ہو گیا۔

ایسے نازک ترین لمحات میں مولانا نے اپنی کتابیں لکھیں مبادا کہ بعض دیگر تاریخ اسلام کے اس سب سے زیادہ خوش باب کے حالات طاقِ نسیاں کی زینت ہو جائیں۔ مولانا کے لیے عجیب محضہ کا عالم تھا اگر آپ حقائق کو منہ عن بیان کرتے تو پھر سے قید و بند کی تنہائیاں اور بجز و سلاسل کی سختیاں تھیں مگر ان سے تو آپ قطعاً خائف نہ تھے البتہ اس بات کا زبردست امکان تھا کہ حکومت اللہ کی اشاعت میں زبردست رکاوٹ ڈال دے گی یا تمام سو فیصد کر لے گی اور یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔ اس لیے مولانا مرحوم نے حالات کے ان تقاضوں کے پیشِ نظر جہاں تک ممکن ہو اوقات میں چمک بیدار کر کے حکومت کی دستبرد سے محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں آپ سے ~~مشتق~~ مشتق بھی ہوئی ہوں تو آپ معذور ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ "ذکرہ شہید" ص ۲۱۵ - ۲۱۶ از محمد خالد سیف۔

مولانا محمد جعفر کے علاوہ چٹنہ کے مولانا بھائی علی، مولانا عبدالرحیم حسین بن منگھو انبالہ کے شیخ محمد شفیع، عبدالکریم محمد نمبر کے حبشی بن محمد بخش اور میاں عبدالغفار، تھامنی محمد جان، عبدالغفور اور الہی بخش بن کریم بخش انبالہ کے مقدمہ میں ماغذ تھے۔

پولیس کے ان بے گناہوں پر ظالم، تشدد اور
پولیس تشدد کی ایک مثال زد و کوب کا اندازہ اس سے لگائیے کہ عباس

نامی ایک لڑکا، جس نے مدت تک میرے گھر میں رہ کر پورس پائی تھی، جب مجھے دیکھ کر
 محبت کے مارے مجسٹریٹ کے پاس جھوٹا اور آئینہ بیان دینے سے جھکایا تو اسی روز رات کو
 اس بچے کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ بھڑکاب نہ لاتے ہوئے قبل از پیشی مقدمہ سیشن ہی دم توڑ گیا
 مگر بدنامی کے ڈر سے پٹھن کے لیے پارسن نے یہ مشورہ کر دیا تھا کہ اس کی وفات کسی مرض کی
 وجہ سے ہوئی ہے۔

جب ہم پہلے دن مجسٹریٹ میں حاضر کیے گئے، تو
بھائی کا جھوٹی گواہی سے انکار میرا بھائی بھی پولیس کے زیر حراست گواہوں

میں سے تھا۔ اس نے ایک سپاہی کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع دی کہ پولیس نے مارپیٹ کر مجھے
 تمہارے خلاف گواہ بنایا ہے لہذا اب جس وقت برسر اجلاس بیان ہوں گے تو میں اپنے اس
 بیان سے پھر جاؤں گا، جسے مارپیٹ کی وجہ سے لکھوایا ہے۔ میں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میری
 آزادی اور قید خدا کے ہاتھ میں ہے، تمہاری گواہی پر نوبت نہیں۔ اگر تم نے حلفیہ بیان دیا ہے
 تو پھر جانے کی صورت میں بجرم دروغ حلفی نہیں سزا ہوگی۔ میں تو پہلے سے پھنسا ہوا ہوں
 تمہارے پھنس جانے کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ضعیف والدہ صاحبہ شاید صدمہ کی تاب نہ لا
 سکیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو بیان تم نے پہلے لکھوایا ہے، اسی پر قائم رہو لیکن بائیں ہمہ
 جب اس کا میرے سامنے بیان ہونے لگا تو وہ پہلے بیان سے منحرف ہو گیا۔ برسر اجلاس اس
 کا انکار سن کر صاحب لوگ پہلے تو بڑے برا فروختہ ہوئے اور پھر اس کی صغرسنی کی وجہ سے اسے
 کوئی سزا نہ دے سکے اور اس کا نام گواہوں کی فہرست سے نکال دیا۔

گواہوں کی کثرت کی وجہ سے یہ مقدمہ ایک ہفتہ تک مجسٹریٹ کی کچری میں پیش ہوتا رہا۔ صاحب
 لوگوں کا تعصب ہم سے اس حد تک تھا کہ جب مقدمہ کی پیشی کے وقت ہم نے یہ درخواست کی کہ

ہماری نماز کا وقت آگیا ہے لہذا ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے لیکن انہوں نے ہمیں یہ اجازت نہ دی مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے ہم نے عین دوران مقدمہ میں، تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔

مقدمہ سیشن سپرد | ایک ہفتہ کی کارروائی کے بعد ہمارا مقدمہ سپرد سیشن ہوا۔ اس وقت تک ہم پچانسی گھروں میں علیحدہ علیحدہ قید تھے۔ سیشن سپردگی کے بعد ہم سب کو حوالات میں ایک جگہ بند کر دیا گیا۔ ایک مدت کی پچاکشی کے بعد ہم سب دوست ایک جگہ جمع ہوئے تو ہماری مسرت کی انتہا نہ رہی تھی تو اکثر سعدی کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

پائے در زنجیر پیش درستان

بر کہ با بیگا نگان در بوستان

مگر چار ماہ کے اس قلعہ اور تنہائی سے بھی ہم لوگوں کو بہت روحانی فائدہ ہوا تھا قلب کے آئینہ صافی میں افواہی خوب محسوس ہوتے تھے۔ نماز روزے میں کمال لذت حاصل ہوتی تھی کہ شاید وہ کیفیت برسوں کی چاکہ کشی اور گوشہ نشینی بھی حاصل نہ ہوتی۔

مولانا یحییٰ علی کی صحبت | اس وقت محمد شفیع اویسی الحکیم تو کسی قدر کشیدہ خاطر رہا کرتے تھے لیکن مولانا یحییٰ علی صاحب نے کی صحبت غنیمت

۱۔ حضرت مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا احمد راشد کے برادر امیر اور حضرت مولانا دلالت علی صادق پورچ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ چہ شے ان کے ساتھ رہے اور پاکستان کی لڑائیوں میں دست راست جس دوام بیور وہاں سے شور کی سزا کا شیعہ ہوئے ۲۶ شمالی ۱۲۸۳ھ ۲۰ فروری ۱۹۶۵ء کو آٹان میں اللہ کو پیار سے چھوئے۔ صاحب فرمائیے تذکرہ صادقہ ص ۶۳-۶۴ سوانح مجاہدین ص ۳۷۲،

۲۳۵، ۲۳۲ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۶-۱۰۷، ۱۰۸-۱۲۸۔

سے کم نہ تھی۔ اسی طرح ہم باقی نو آدمی بھی اس حالات میں نہایت شاداں اور فرحان تھے اور یہ خاکسار تو جب اپنی ذلیل النبی اور کم علمی کے مقابلے میں ان انعامات الہی اور اس سرفرازی کو دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ میری مثال تو ٹھیک اسی طرح ہے، جیسے سفارش، استحقاق اور ذاتی قیادت کبھی بغیر ہی کسی چار کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا جائے۔ اللہ اللہ! میرا حسب نسب اور لیاقت کہاں اور راہ خدا کے امتحان میں ثابت قدم رہنے کی یہ سرفرازی کیسی! اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبرؐ اور صحابہ کرامؓ کو بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر اور استقلال کو انعام خداوندی سمجھنے کی وجہ سے میری زبان تو اول سے آخر تک شکر کے ترانوں سے لبریز رہی۔

مولانا نجی علی صاحب کی کیفیت تو اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی۔ آپ اکثر ان اشعار کو پڑھا کرتے تھے۔

فلست ابالی حین اقتل مسلماً علی ای شتی کان فی اللہ مصرعی
و ذلک فی ذات اللہ وان یشاء یبارک علی افعال شلو ممدوح
ترجمہ :- ”مسلما ہونے کی حالت میں مجھے جس کروٹ بھی مارا جائے، اس کی قطعاً پرواہ نہیں، کیونکہ مجھے خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان پلگانڈہ ٹکڑوں کے بلا دینے پر ان میں برکت فرما دے۔“
مشہور صحابی حضرت حبیبؓ کو جب کفار کے چٹائی دینے لگے، تو آپ نے ان اشعار کو نہایت جوازدی سے پڑھتے ہوئے، راہ خدا میں جان دے کر خلعت شہادت کی سرفرازی کو حاصل کر لیا تھا اور آپ کی خبر شہادت اور سلام شوق کو خود حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک مدینہ منورہ میں پہنچایا تھا۔

مولانا نجی علیؒ جب حضرت ستیا احمد شیدؒ کے فراق میں یہ شعر بھی بڑے درد اور عشق سے اکثر پڑھا کرتے تھے۔

اتنا پیغام درد کا کنا، جب صبا کو نئے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے، دن بہت انتظار میں گزرے

مقدمہ کی پیروی | کچھ عرصہ کے بعد اپریل کے آخر میں یہ مقدمہ باجلاس میجر ایڈورڈز محکمہ سیشن میں پیش ہوا اور ایک ہفتہ تک رو بکاری ہوتی رہی - محمد شفیع اور عبدالکریم کی طرف سے سٹرکڈال بیرسٹر محکمہ مجسٹریٹ میں وکیل اور پیر وکار تھے۔ جب یہ مقدمہ کچر می سیشن میں پیش ہوا تو مولوی محمد حسن اور مولوی مبارک علی صاحب نے، جو پٹنہ والوں کی طرف سے پیر وکار تھے، سٹرکڈال ڈن نامی ایک دوسرے وکیل کو بلایا۔ یہ وکیل بڑا جہاں دیدہ اور فہیدہ آدمی تھا۔ جب پٹوٹن اپنا مختار نامہ لے کر، حوالات میں ہمارے دستخط کرانے آیا، تو مولانا عبدالرحیم صاحب، مولانا کچی علی صاحب، الٹی کچش سوداگر، حسینی، قاضی میاں جان، عبدالغفار اور منشی عبدالغفور صاحب نے تو اس پر دستخط کر دیئے، مگر میں نے نہ کیے اور کہا کہ میں وکیل ہوں، اپنی جواب دہی آپ کر دوں گا۔

مولانا کچی علی صاحب وکیل کی تقرری اور روپیہ کی بربادی سے ماضی نہ تھے بلکہ اگر دوسرے لوگ آپ کو نہ روکتے تو آپ اپنے نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے لیکن آپ کی طبیعت اس قدر سیدھی سادی اور بے عذر تھی کہ جب آپ سے مختار نامہ پر دستخط کرنے کے لیے کہا گیا تو اس پر دستخط کر دیئے۔

حکومت کی طرف سے میجر وکیل اور پیر وکار اور وکیل تھے اور دس مدعا علیہم کی طرف سے دو وکیل تھے اور میں بذات خود اپنی جواب دہی کرتا تھا۔ جب کوئی گواہ پیش نہیں ہوتا تو اس کا جواب سیشن جج خود لکھتے اور اس پر جرح کرتے۔ اس کے بعد سرکاری وکلاء پھر مدعا علیہم کے دونوں وکلاء اور آخر میں یہ خاکسار جرح کے سوالات کرتا چونکہ میں سب سے زیادہ اس مقدمہ سے واقف تھا، گواہوں کے حالات اور لیاقت سے بھی کوئی آگاہ تھا اور فن و کلاست میں بھی پورا پورا تجربہ رکھتا تھا اور پھر اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

دوسروں کی نسبت مجھے جرح کے ایسے ایسے سوالات سنبھتے کہ اکثر گواہ میرے سوالات کے جواب سے تنگ آکر دوہائی دوہائی کرنے لگتے تھے۔

اجلاس عام ہونے کی وجہ سے بہت سے یورپین اور ملکی تماشابین حاضر ہو کر یہ تماشا دیکھنا کرتے تھے۔ چار اسیر و ہندو، دو مسلمان رؤسا صلیح انبالہ سے بلائے گئے تھے جب شہادتِ طرفین تمام ہو گئی تو مدعا علیہم کے جواب لیے گئے۔ دس مجرموں کا جواب تو ان کے وکیلوں نے تحریری داخل کیا۔ آخر میں جب سیشن جج نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے؟“ تو میں نے حکومت کے ہر ایک ثبوت کی تردید کر کے اپنا جواب نہایت شریح اور مدلل لکھنا شروع کیا۔ جج صاحب نے کچھ تو لکھا اور پھر بڑے غصہ سے کہا کہ اس جواب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے قصور کا اقبال کرو اور عدالت سے مہربانی اور رحم کی اپیل کر کے معافی مانگو۔ میں یہ مخالفہ تعلیم کا سبق سن کر چپ ہو رہا اور کہا کہ میں فقط انشا پابستہ ہوں، جس کی آپ سے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ میں نے اپنی بریت کے لیے دس بارہ گواہ بلانے چاہے لیکن اس کی بھی اجازت نہ ملی بلکہ ۱۸۶۲ء کو جب عدالت کا آفری فیصلہ سنایا جانا تھا، اپنے گواہوں کو خود حاضر کرا دیا لیکن انہیں بھی اظہار خیال کا موقع نہ دیا گیا۔

محمد شفیع اور اکثر دوسرے مدعا علیہم کی طرف سے بھی بہت سے گواہ پیش ہوئے لیکن بے سود بلکہ محمد شفیع کی طرف سے تو حکومت کی خیر خواہی و خیر سگالی اور عمدہ کارگزاری کے ایک سو سے زیادہ سرٹیفکیٹ پیش ہوئے لیکن اس متعصب جج نے ان سرٹیفکیٹوں کے متعلق یہ لکھا کہ ان کا ایک فقرہ محمد شفیع کے مجرم اور سزا کے سخت کے مستحق ہونے پر ایک دلیل صلیح اور برہان قاطع ہے۔

مسٹر پلاؤڈن ہمارے لائی اور ویرینہ وکیل

تھے، انہوں نے بہت سی قانونی کتابوں

مسٹر پلاؤڈن کے قانونی نکات

اور نظائر سے ثابت کر کے یہ جواب لکھا تھا کہ ستمناہ وغیرہ — جہاں یہ جنگ ہوئی، جس

میں اعانت کا ان لوگوں پر الزام ہے — سرکار کی عہداری سے باہر ہے۔ لہذا یہ جبرم دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کے تحت نہیں آتا۔ دفعہ ۱۲۱ صرف ان اقدامات جنگ پر لاگو ہوتی ہے جو سرکاری علاقوں کے اندر عمل میں لائے جائیں۔ تھانہ اور ملکا باہر خالی برطانوی علاقے سے باہر اور آزاد علاقے ہیں۔ سیشن جج ہر برٹ ایڈورڈز نے یہ اعتراض مسترد کر دیا تو پلاڈوٹن نے دوسرا اعتراض پیش کر دیا کہ میرے چھ نوکروں (مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، حسینی تھانیسری، حسینی غلام آبادی، عبدالغفار اور انٹی کنجش) میں سے پانچ کے خلاف مقدمہ اس عدالت میں نہیں چل سکتا کیونکہ انبلاڈویشن کی عدالتیں یقیناً گورنر پنجاب کے ماتحت ہیں اور میرے پانچ نوکل غلام آباد کے رہنے والے ہیں جو گورنر بمبائل کے ماتحت ہے۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۲۶ اور ۲۷ کے مطابق جرائم کی تحقیقات یا قوان اصلاح میں ہونی چاہیے جہاں ان کا ارتکاب ہوا، یا ان اصلاح میں جہاں ان کے نتائج برآمد ہوئے۔ دفعہ ۲۸ کے ماتحت شرکت اور اعانت کی صورت بھی یہی ہے۔

جب سیشن جج اور دوسرے انگریزوں نے وکیل کی یہ دلیل سنی تو سکتے میں رہ گئے اور سوائے ہلی اور بجا کے ان سے کوئی جواب نہ ہی پڑا۔ لیکن اس مقدمہ میں تو انگریزوں نے تعصب کی انتہا کر دی تھی اور مقدمہ کی کارروائی کے آغاز ہی سے قانون کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ مسٹر بلڈین کے اس قانونی نکتہ کا جواب دینے کے لیے باہم مشورہ کی غرض سے مقدمہ کو چند روز تک ملتوی کر دیا گیا اور گورنر جان لارنس اور دیگر ان افسروں سے مشورہ کیا گیا جو ہمارا قلع قمع ہی چاہتے تھے کیونکہ خود غرض لوگوں نے انہیں یہ سبق پڑھایا ہوا تھا کہ جب ان غریب بلایوں کو پھانسی دے کر نیست و نابود نہ کر دو گے، عہداری سرکار ہند میں رہنا محال ہے۔ ان حالات میں قانون کو کون منسا ہے؟

فیصلہ مدت دراز تک التوا کے بعد ۲۱ مئی ۱۸۶۲ء کو سیشن جج نے آخری

ہو بس بلایا اور گورنر کے ایما سے اپنی تجویز اور سزا گھر سے لکھ لیا۔ اجلاس کے بعد ہی میں
میشن جج نے پہلے چاروں امیروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے اس مقدمہ کو اڈل سے آخر
حکم سنا، اب آپ کی جوراٹے ہو لکھ کر پیش کر دے ہم نے دیکھا کہ وہ چاروں امیر اس وقت
ہی ہماری شکلوں کو دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رٹائی کے غواہاں تھے لیکن
جب انہوں نے یہ دیکھا کہ جج اور کمشنر انہیں سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں، تو ڈر کے مارا انہوں
نے بھی یہ لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی ان پر جرم ثابت ہے۔

اس قانونی جیلہ کے حصول کے بعد جج اور کمشنر نے اپنی اس تجویز کو جو پہلے سے میز پر
لی برتی رکھی تھی، پڑھنا شروع کیا اور آئیں بائیں شائیں کر کے مسٹر پلوٹون کی دلیل کو ٹال دیا
سب سے پہلے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ تم بہت عقل مند
نہ ا کا فیصلہ

ذہن کا قانون دان، اپنے شر کے منبر دار اور رئیس ہو۔ تم
بے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعہ سے
سرکار کے دشمنوں کو آدمی اور روپیہ جاتا تھا۔ تم نے انکارِ بحث سے کام لیا اور سرکار کی غیر
کا قطعاً آدمی بھرا اور فمائش کے باوجود تم نے قطعاً سرکار کی غیر خواہی منگی لہذا تمہیں پچاسی
دی جائے گی، تمہاری کل جائیداد بھی سرکار ضبط ہوگی، تمہاری لاشیں بھی وارثوں کو نہیں دی جائے
گی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ جیل کے گورستان میں گاڑ دی جائے گی۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ
ہیں نہیں پچاسی پر لگتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔

صاحبِ موصوت کا یہ سارا بیان میں نے نہایت سکوت سے سنا اور صرف آخری فقرہ کے
جواب میں کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت
تو دے کر میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے لیکن اس جواب باصراب سے وہ بہت
خفا ہوا۔ مگر پچاسی کا حکم دینے سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؟ جس قدر سزائیں اس کے اختیار
میں تھیں، دے چکا تھا۔ اس وقت میرے منہ سے یہ الہامی فقرہ نکلا کہ میں تو اس وقت

ہے تو ہم سب کو گریوالمباس پہنا دیا گیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو تو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھڑوں میں بند کر دیا گیا اور باقی آٹھ آدمیوں کو جیل میں دوسرے قیادوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔

۱۲ مئی کی رات جب ہم جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں داخل ہوئے تو پہلی رات ہی جہنم کا ایک نمونہ مل گیا۔ صبح ہم نے اہالیان جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کی اور چاہا کہ رات کو ہمیں ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے مگر جیل خانہ کے سب اہلکاروں کے ارے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ جب یہ انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلے اسی وقت ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لغافہ لے کر پہنچا۔ کھول کر جو دیکھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بدقت شب باہر سلا یا کرو۔ تاہم الٹی کا یہ طرفہ تماشا دیکھ کر اسی دم جیل والوں نے ہمیں یہ حکم سنا دیا کہ ہمارے لیے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور ان کے ریشمی رستے تیار ہوئے ہیں اور ادھر پھانسی کی منظوری کے لیے مقدمہ کی مسل کو پنجاب کے محکمہ چیف کورٹ میں بھیج دیا گیا۔

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زمانہ مختار لے کر مولانا محمد حسن صاحب، مولانا مبارک علی صاحب

چیف کورٹ میں اپیل

برادر محمد سعید اور عبدالرحمن سپر محمد شفیع کے ہمراہ چیف کورٹ میں پہنچے اور میر وکیل وغیرہ سرکاری وکلاء اور پیروکار بھی سب سے پہلے حاضر ہو گئے تھے اور ادھر جیل میں نقل حکم منگو کر میں نے بھی خوب مدلل اپیل لکھ کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت چیف کورٹ روانہ کر دی۔

چیف کورٹ کے چند اجلاسوں میں بھی یہ مقدمہ بڑی دھوم دھام سے پیش ہوا اور وہاں جی ہمارے وکیل مسٹر پوٹن نے بڑے دلائل سے بار بار یہ کہا کہ یہ لوگ زیر دفعہ ۱۲۱ ہرگز قید نہیں ہو سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا سراسر خلاف قانون ہے، ان پر کوئی دہری دفعہ قائم نہ کرو۔ اس زمانہ کے بوڈینشل کوشنر مسٹر رابرٹ کسٹ نے بھی وکیل کی اس قانونی دلیل کو برابراجلاس تسلیم کر لیا لیکن مشورہ کرنے کی غرض سے پھر چند روز تک التوا

ہے تو ہم سب کو گریوالمباس پہنا دیا گیا۔ ہم تین پھانسی والوں کو تو علیحدہ علیحدہ تین پھانسی گھڑوں میں بند کر دیا گیا اور باقی آٹھ آدمیوں کو جیل میں دوسرے قیادوں کے ساتھ ملا دیا گیا۔

۱۲ مئی کی رات جب ہم جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں داخل ہوئے تو پہلی رات ہی جہنم کا ایک نمونہ مل گیا۔ صبح ہم نے اہالیان جیل خانہ سے اپنی یہ تکلیف بیان کی اور چاہا کہ رات کو ہمیں ان کوٹھڑیوں سے باہر رکھا جائے مگر جیل خانہ کے سب اہلکاروں کے ارے انکار کر کے باہر چلے گئے۔ جب یہ انکار کر کے جیل خانہ سے باہر نکلے اسی وقت ایک سوار تار گھر سے ایک ضروری لغافہ لے کر پہنچا۔ کھول کر جو دیکھا تو اس میں یہی لکھا تھا کہ ان تینوں پھانسی والوں کو بدقت شب باہر سلا یا کرو۔ تاہم الٹی کا یہ طرفہ تماشا دیکھ کر اسی دم جیل والوں نے ہمیں یہ حکم سنا دیا کہ ہمارے لیے بڑے اہتمام سے تین نئی پھانسیاں اور ان کے ریشمی رستے تیار ہوئے ہیں اور ادھر پھانسی کی منظوری کے لیے مقدمہ کی مسل کو پنجاب کے محکمہ چیف کورٹ میں بھیج دیا گیا۔

ہمارے دونوں وکیل بھی کچھ زمانہ مختار لے کر مولانا محمد حسن صاحب، مولانا مبارک علی صاحب

چیف کورٹ میں اپیل

برادر محمد سعید اور عبدالرحمن سپر محمد شفیع کے ہمراہ چیف کورٹ میں پہنچے اور میر وکیل وغیرہ سرکاری وکلاء اور پیروکار بھی سب سے پہلے حاضر ہو گئے تھے اور ادھر جیل میں نقل حکم منگو کر میں نے بھی خوب مدلل اپیل لکھ کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت چیف کورٹ روانہ کر دی۔

چیف کورٹ کے چند اجلاسوں میں بھی یہ مقدمہ بڑی دھوم دھام سے پیش ہوا اور وہاں جی ہمارے وکیل مسٹر پوٹن نے بڑے دلائل سے بار بار یہ کہا کہ یہ لوگ زیر دفعہ ۱۲۱ ہرگز قید نہیں ہو سکتے۔ اس دفعہ کی رو سے انہیں قید کرنا سراسر خلاف قانون ہے، ان پر کوئی دہری دفعہ قائم نہ کرو۔ اس زمانہ کے بوڈینشل کوشنر مسٹر رابرٹ کسٹ نے بھی وکیل کی اس قانونی دلیل کو برابراجلاس تسلیم کر لیا لیکن مشورہ کرنے کی غرض سے پھر چند روز تک التوا

کیا گیا۔ اسی اثنا میں اخبارات نے یہ خبر شائع کر دی کہ یہ لوگ رہا ہو چکے ہیں صرف حکم سنا
 باقی رہ گیا ہے۔ ہمارے گھروالوں کو تو ہماری رہائی کا اس قدر یقین ہو گیا کہ انہوں نے گھر سے
 کپڑوں کا ایک نیا جوڑا بھی تیار کر کے بھیج دیا کہ رہائی کے دن اسے زیب تن کر کے گھر آؤں
 لیکن چیف کورٹ کا التزام بہت لمبا ہو گیا۔ ہماری خلافت قانون قید پر غالباً انگلستان تک
 سے رائے لی گئی۔

۲ مئی پھانسی کے حکم سنائے جانے کی تاریخ سے لے کر ۱۴ ستمبر تک ہم پھانسی گھروں
 میں رہے۔ اہلیان جیل ہمارے پھانسی دینے کا سامان تیار کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا
 تماشہ بن رہے تھے۔ صد ہا صاحب لوگ اور ہم ہیں دیکھنے کے لیے روزانہ پھانسی گھروں میں
 آتے تھے۔ دوسرے پھانسی والے عام قیدیوں کے برعکس جب یہ یورپین زائرین ہمیں نہایت
 شاداں و فرحاں دیکھتے تو ازراہ تعجب اکثر ہم سے پوچھتے کہ تمہیں تو بہت جلد پھانسی ہوگی پھر تم اس
 قدر خوشی کا اظہار کیوں کرتے ہو۔ ہم اس کے جواب میں صرف یہ کہتے تھے کہ ہمارے مذہب
 میں خدا کی راہ میں، ایسے ظلم سے مارے جانے پر شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس
 پرست کا اظہار کرتے ہیں۔

خدا کی شان ملاحظہ فرمائیے کہ ہم پھانسی گھروں میں ہی تھے کہ بقر عید آگئی۔ ہمیں خیال آیا
 کہ آج مسلمان قربانی کا گوشت خوب اڑاتے ہوں گے۔ اللہ نے ہمارے لیے پھانسی گھروں
 میں ہی عید کا سامان مہیا فرما دیا، وہ اس طرح کہ اس خیال کے تھوڑی دیر بعد ہی رات کے
 وقت پلاؤ، قورمہ اور کباب وغیرہ بقر عید کے سب کھانے ہمارے لیے ان پھانسی گھروں
 میں غیب سے موجود ہو گئے۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا اور خدا تعالیٰ کا شکر بجالائے۔

ایک رات ہم تینوں آدمی پھانسی گھر میں ایک بگڑ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اس
 وقت ہمارے سب محافظ باہمی مشورہ کے بعد ہم سے کہنے لگے کہ تم تینوں اس وقت اندھیری
 رات میں بھاگ جاؤ۔ ہمیں غفلت کے جرم میں کچھ قید وغیرہ کی سزا ہوگی جسے ہم محبت لیں گے لیکن

تمہاری جانیں تو بچ جائیں گی۔ ہم نے ان کی ہمت اور نیت خیر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ خداوند کریم دونوں جہان میں تمہیں اس نیک نیتی کا اجر دے مگر ہم فرار نہیں ہوں گے۔ جب خدا چھڑا دے گا، خود بخود چھوٹ جائیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بھائیو! جب اس کی مرضی نہ ملتی تو میں علی گڑھ سے پھڑا گیا۔ اب دوبارہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

رشتہ در گردنم انگسندہ و دست

مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

قاضی میاں جان کا انتقال
پھانسی گھروں میں قید ہی تھے کہ قاضی میاں جان صاحب بیمار ہو گئے۔ آپ کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا لیکن اس کے باوجود آپ ہسپتال سے پھانسی گھروں میں ہماری ملاقات کے لیے اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ وفات سے ایک دو روز قبل انہوں نے یہ خواب دیکھا کہ آسمان سے ایک تخت جو ہر دار اتر رہا ہے اور ان کو اس پر بٹھا کر آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ گویا خواب کی تعبیر یہ ہوئی کہ وہ تخت جنت الفردوس سے کیا تھا اور انہیں لے گیا۔ یہ بزرگ ہم سب لوگوں سے عمر تھے مگر بایں ہمہ بڑے صابر اور مستقل مزاج تھے۔ خداوند کریم انہیں جنت الفردوس نصیب فرمائے۔ ہمارے ساتھیوں نے تجزیہ و تکفین اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد گورستان جیل میں انہیں سپردِ خاک کرا دیا۔

آہِ والدہ مرحومہ
انہی ایام کا ذکر ہے کہ تھانیسریں والدہ ماجدہ کو سانپ نے ڈس لیا اور اس کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔ سنا ہے کہ آپ

بہت استقلال سے جاں بحق تسلیم ہوئیں۔ لوگوں نے بھارت چھوٹ کر نئے والے مشرک لوگوں کو بلا کر ان کی صحت کے لیے کچھ شرکیہ رسومات کرنا چاہا تھا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی اور فرمایا کہ مدت ہوئی، مشرک و بدعت میرے گھر سے اٹھ گیا ہے۔ اب میں اپنے بیٹے کی غیر حاضری میں اپنے گھر میں مشرک نہ ہونے دوں گی، ایسی بے ایمانی کی حیات سے موت افضل ہے

جب ان کے انتقال پر ملال کی خبر ہمیں پچانسی گھروں میں ملی تو اسی رات مولانا یحییٰ علی صاحب نے مراقبہ میں دیکھا کہ وہ جنت میں بڑی شان و شوکت سے ایک تخت پر بیٹھی ہیں۔ پوچھا آپ کو یہ مرتبہ عالی کس سبب سے ملا؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے کے آلام و مصائب پر صبر کرنے کے باعث، میرے رب نے بخش دیا اور مجھے یہ درجہ عنایت فرمایا۔ اس وقت کی وفات بھی ایک امتحان پر امتحان تھا کہ جان، مال، آبرو اور ہر چیز کی پوری پوری آزمائش کی جائے۔

مستی دار کو حکمِ بندِ حق ملا
کیا کموں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی!

کالے پانی کی سزا

محمد علی جوہر

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب ہم پچانسی گھروں میں قید تھے، انہی دنوں ایک مقبول بارگاہ الہی پر اللہ رب العزت نے یہ منکشف فرمادیا تھا کہ ہمیں پچانسی نہیں ہوگی بلکہ کالے پانی کو جانا ہوگا اور میں پھر وہاں سے باعزت زندہ سلامت آؤں گا؛ چنانچہ اس پیش گوئی کے دو ماہ بعد ہماری پچانسی کا حکم موقوف ہوا لیکن ہمیں پیش گوئی سننے ہی پر یقین ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسی وقت اپنے بھائی اور بعض دوستوں کو یہ خوشخبری لکھ دی تھی۔ اس وقت چونکہ تمام انگریزی سلطنت اتفاق ہمارے پچانسی دینے پر مستعد تھی اس وجہ سے شاید دوسرے لوگوں کو اس پیش گوئی کا یقین نہ ہوا اور خصوصاً جب کہ صورت حال یہ تھی کہ اگر کوئی شخص ہمارے حق میں ذرا بھی کلمہ خیر کہتا تو قید ہو جاتا تھا۔ ہمارے شہر کے مسیّد آدمی صرف اس قسم کے قصور میں قید ہو گئے کہ ان میں سے کسی کے پاس سے میرا کچھ مال و اسباب ملا یا میرے مکانات کی ضبطی و نیلام کے بعد کسی نے اپنے گھر میں میرے بال بچوں کو جگہ دی۔ اس وقت اگر شاہِ دوم بھی انگریزوں سے میری سفارشیں کرتا تو کبھی منظور نہ کرتے، ان حالات میں پچانسی کی موقوفی غیر ممکن اور بالکل بعید از قیاس تھی۔

اب اس مقابلہ القلوب کی ظاہری کارروائی سنئے کہ جب بہت سے صاحب اوریم
ہیں پھانسی گھروں میں نہایت شاداں و فرحاں دیکھ گئے تو سب لوگوں میں یہ چرچا پھیل گیا۔ ہمارے
جانی دشمن انگریزوں نے یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو مذہبی موت تو نہیں دینی چاہیئے کہ جس
پر وہ اس قدر مسرت کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ انہیں کالے پانی بھیج کر وہاں کے آلام و مصائب
کا تخیل مشق بنانا چاہیئے۔

ہماری پیش گوئی کے مطابق ۱۶ ستمبر کو ٹیٹل کمشنر انبالہ پھانسی گھروں میں تشریف لائے
اور جینٹ کورٹ کا حکم پڑھ کر سنایا کہ تم لوگ پھانسی کی سزا کو بہت محبوب سمجھتے ہو اور اسے شہادت
تصور کرتے ہو اس لیے حکومت تمہیں سزا دینے کے لیے تیار نہیں لہذا تمہاری
پھانسی کی یہ سزا جس دوام و عبور درپائے شور سے بدلی جاتی ہے۔

اس حکم کے سننے کے ساتھ ہی ہمیں پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ
عام بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانہ کے دستور کے مطابق قیدیوں سے ہماری داڑھی، مونچھ اور سر کے
بال وغیرہ تراش کر ایک منڈی بھڑکی طرح بنا دیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ مولانا یحییٰ علی
صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا کر کہتے تھے :-

”افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کے واسطے

کتری گئی۔“

قدرت الہی کا ایک اور تماشہ بھی قابل ذکر ہے کہ میرے جیاری مجرم ہونے
کی وجہ سے میرے لیے ریشمی بستہ اور پھانسی کا تختہ خاص طور پر نہایت
مضبوط تیار کر لیا گیا تھا مگر خدا کے حکم سے میری پھانسی تو موافقت ہوئی اور اسی اثنا میں خاص
ولایت کے انجمن میں ایک گورے کو قتل کے جرم کی پاداش میں پھانسی کا حکم ملا اور پھانسی
کا وہ سب سامان جو میرے لیے تیار کیا گیا تھا اس لیے چارے ہم قوم یورپین کو نصیب ہوا۔ ص
چاہ کن را چاد در پیش

جور سے میرے گلے میں ڈالنے کے لیے انگریزوں نے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا اس قادیان مطلق مقرب انقلاب نے ان کے ایک بھائی کے گلے میں ڈلوادیا اور مجھے صاف صاف بچالیا۔ اس عجیب و غریب واقعہ کو لوگ اسرار و آیات الہی سے تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس گورے کی پھانسی کے بعد لوگوں نے اس رستے کے ٹکڑے بھی تبرکات تقسیم کر لیے تھے۔

..... جیل کی مشقت بھی

پھانسی کی موقوفی کے حکم منانے کے بعد دوسرے روز دیگر قیدیوں کے ساتھ ہمیں بھی مشقت کے لیے بھیجا گیا۔ بنی بخش داروغہ جیل، رحیم بخش نائب داروغہ اور دوسرے سب ایسی افسر گروہا سے عنایت فرماتے لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے خوف کی وجہ سے ہم تینوں آدمیوں کو کاغذ کوٹنے کی ڈھینگلی کے کام میں لگا دیا جو اس جیل میں سب سے زیادہ سخت کام تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم نے اس کو پاؤں سے ہلایا تو پاؤں شل ہو گئے مگر اسی وقت ڈاکٹر بسین عرف ریو سپرنٹنڈنٹ، جیل کے کاغذ گھر میں آئے اور ہمیں ڈھینگلی کے سخت کام میں دیکھا تو داروغہ پر بہت خفا ہوئے اور ہمیں اس سخت کام سے نکال کر محمد شفیع اور مولانا یحییٰ علی صاحب کو قوسوت کھولنے کے کام میں لگا دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ناؤ کے پاس لے گئے، جس میں کاغذ پھاڑ کر بھگڑے جاتے تھے اور مجھے کہا کہ یہ دفتر کی ردی ہے غالباً تمہارے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذ بھی اس میں ضرور ہوں گے۔ تم اپنا دل ہلانے کے لیے ان کاغذات کو پڑھتے بھی رہو اور ردی کو پھاڑ پھاڑ کر اس ناؤ میں ڈالتے بھی جاؤ۔ اللہ کے فضل سے میری مشقت دل لگی اور تفریح طبع سے غالی نہ تھی اور دوسرے ساتھی بھی کسی سخت کام میں نہ تھے۔ ہم دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو سب کے سب ایک جگہ بارک میں جا کر سو رہتے۔

جب ہم جیل گئے تو قیدیوں کو صرف روٹی، وال اور ہفتے میں دو یا تین دن تیل کا چھٹا ہوا ہوئی ترکاری ملا کرتی تھی۔ گھی، گوشت یا دودھ ہی ابتدائے عملداری سرکار سے کبھی کسی قیدی نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ تاہم الہی ہمارے شامل حال ہوئی کہ جو ہی ہم جیل میں داخل ہوئے،

انسپکٹر جنرل مجلس پنجاب کے حکم سے پنجاب کے تمام قیدیوں کو عمدہ گوشت، گھی اور دہی ملنے لگی۔ ان غیر مترقبہ نعمتوں کو دیکھ کر سب قیدی ہیں دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب تمہارے وجود مسود کی برکت کا نتیجہ ہے۔ طرزیہ کہ جب تک ہم لوگ جیل ہائے پنجاب میں رہے، تب تک یہ چیزیں سب جیل خافوں میں برابر ملتی رہیں مگر ہمارے کالے پانی کو روانہ ہونے کے ساتھ ہی ایک قلم بند ہو گئیں بلکہ ہمارے جانے کے بعد بے چارے قیدیوں کو گندم کی روٹی کے بجائے جوار باجرے کی روٹیاں ملنے لگیں۔

بیماری ہم اہل جیل ہی میں تھے کہ قیدیوں میں دہائی بخار اور سرسام بڑے زور شور سے پھیلا۔ کوئی چوتھے حصے کے قریب قیدی اس مرض سے فوت ہو گئے۔ کیفیت یہ تھی کہ بخار ہو جاتا اور کچھ دیر بعد مہین چل بستا۔ مہینے دو مہینے کی میٹا والے بہت سے قیدی مر گئے۔ جیل کے باہر نیچے لگائے گئے اور قیدیوں کو ان میں منتقل کر دیا گیا مگر حضرت بخار نے وہاں بھی چھپانہ چھوڑا۔

خاکسار بھی اس دہائی مرض سے نہ بچا اور سخت بیمار ہو گیا۔ مجھے جیل کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور ڈاکٹر بٹسن صاحب دلی قوس سے میرا علاج کرنے لگے لیکن بخار سے قطعاً آفاقہ نہ ہوا گو سرسام کی فوبت نہ پہنچی تھی مگر میں کئی دن تک بے ہوش پڑا ہوا اور کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ انگریزی دوائیں مجھ پر ذرہ بھر اثر نہیں کر رہی تھیں۔ لاچار ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اس مرض کے لیے تم گھر پر کیا دوا کھاتے تھے؟ میں نے کس ہندوستانی دوائیں کھاتا تھا، انگریزی دوائی کبھی استعمال نہیں کی شاید یہی وجہ ہے کہ ان دواؤں سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے کہا تمہیں ان دواؤں کے نام معلوم ہیں؟ نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا اچھا ان دواؤں کے نام ایک کاغذ پر لکھ دو ہم تمہیں بازار سے منگوادیں گے۔ میں نے مرتبہ سیدب، مرتبہ مہی، شربت انار، شربت بنفشہ، شربت نیلوفر اور ورق فقرہ وغیرہ عمدہ عمدہ مرے دار و مفرح ادویہ ایک کاغذ پر لکھ دیں اور

انہوں نے اسی وقت وہ سب بازار سے منگوا کر میرے حوالہ کر دیں۔

بیماری کی وجہ سے زبان کا مزہ تو بگڑا ہوا ہی تھا، میں نے ان کو جب یکے بعد دیگرے کھایا تو بہت مزا آیا۔ بخار چونکہ تپ محرقہ کی قسم سے تھا، اس لیے شربتوں کے استعمال سے دوسرے دن ہی اتر گیا۔ مرتبہ جات اور اوراقِ نقرہ کے استعمال سے بدن اور معدہ میں بھی قوت پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے جب دوسرے دن مجھے تندرست دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور نفا بہت دور کرنے کے لیے شور باگوشت اور دودھ مقرر کر دیا۔

دنیا کی دولت اور حشم و جاہ کی ناپائیداری، حالتِ سیمانی اور برعائے کا اندازہ لگائیے کہ خانہ تلاشی سے قبل ۱۲ دسمبر تک میرے پاس ہزاروں روپیہ کی جائیداد منقولہ تھی، بیسیوں آدمی میری رعیت میں تھے، ایک بڑے شہر کا نمبر دار تھا، گھوڑے اور گاڑیاں سواری کے لیے تھیں اور ہر کام کے لیے گھر میں نوکر چاکر تھے لیکن خانہ تلاشی کے چند گھنٹے بعد جب میں فرار ہوا تو سب جاہ و حشم خاک میں مل گیا۔ میرے فرار یا شدید غصہ کی وجہ سے مقدمہ کے اختتام پر صادر ہونے والے حکم سے قبل ہی انگریزوں نے پہلے دن تمام جائیداد قرق کر لی تھی۔ دوسرے دن میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا الغرض ایک ہی رات میں کایا پلٹ گئی۔ کل جس مال و دولت کا میں مالک تھا، آج وہ دوسروں کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ وہ قرق سے قبل جائیداد کا کوئی حصہ علیحدہ کر سکیں فیصلی کا حکم صادر ہونے کے بعد، میرے بھائی نے سب اپنے حصے کا دعویٰ کیا، تو اسے صرف ایک کوٹڑی دی گئی اور باقی سب منقولہ و غیر منقولہ جائیداد تجی سرکار ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ میں نے دورانِ ثن تیاں کرتے ہوئے، اس حادثہ سے سات برس قبل اپنے عقد کی کل جائیداد کو اپنی بیوی کے مہر میں مضمحل کر کے ایک شرعی بیع نامہ لکھ دیا تھا، اب وہ بیع نامہ بھی پیش کیا گیا مگر انگریزوں کو اس قدر شدید غصہ اور تعصب تھا کہ

انہوں نے ایک دشمنی اور میری بیوی اور دو شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔
 بھانسی کے حکم کی تبدیلی کے بعد ہم ستمبر ۱۸۶۳ء سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبارہ جیل
 رہے۔ محمد شفیع کے گھر سے اکثر عمدہ عمدہ کھانا آیا کرتا تھا۔ ہم اسے جیل میں ایک نعمتِ غیر مرتبہ
 سمجھ کر بڑے مزے سے کھا کرتے اور شکرِ الہی بجالا کر دیتے تھے۔

یہاں تک اپنی تعریف لکھتے لکھتے میری نفس بہت بھول گیا ہے اور اکثر مقامات پر اپنی
 تعریف میں مبالغہ کرنا چاہتا ہے لہذا اپنے نفس کے دو عیب بھی یہاں تحریر کرتا ہوں تاکہ
 اس خود پسند مودی کو ذرا ذلت ہو اور پھر مجھے مبالغہ کی ترغیب نہ دے۔

صاف صاف باتیں

ان دو عیوب میں سے ایک تو یہ ہے کہ جب ہم ایک مقفل
 بارک میں سویا کرتے تھے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ ایک
 سپاہی محمد شفیع کے گھر سے پلاؤ لے کر آیا، تو ایک جنگل کی طرف سے پلاؤ لینے کے لیے چلا
 گیا۔ پلاؤ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ ایک بڑی سی بوٹی اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور تھوڑا سا چبا کر
 اسے جھٹ پٹ نکل لینا چاہا، لیکن مالی مسروقہ سلق سے نیچے کیسے اترتا؟ بوٹی حلق میں پھنس گئی،
 نیچے جاتی تھی نہ اوپر آتی تھی، میرا دم گھٹنے لگا اور میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میرا گلا ٹوٹ گیا تو وہ بوٹی باہر نکل
 آئی اور میرے نفس کا یہ عیب سب ساتھیوں کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ اگرچہ محمد شفیع کے ساتھ
 معاملہ ٹھیک تھا اور ان کی طرف سے ہمیں ہر طرح کی اجازت تھی لیکن پھر بھی یہ حرکت طفلانہ اور
 نہایت نازیبا تھی لہذا میں نے مالِ مشتبہ کے سلق سے نیچے اترنے پر شکرِ الہی ادا کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر اپنے نفس کی شرارت کا ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ہمارے جیل
 کے ایک ساتھی منشی عبدالغفور خاں بھی تھے جو کہ ہمارے ساتھ انبارہ جیل میں تھے۔ میرے بھائی
 کے نام ان کے گھر سے دس روپے کا منی آرڈر آیا۔ بھائی صاحب دس روپے کا نوٹ لے
 کر جب میرے پاس آئے تو انہیں بھی رقم کی شدید ضرورت تھی۔ میں نے منشی عبدالغفور خاں کو
 اطلاع کیے بغیر وہ نوٹ اپنے بھائی کو دے دیا اور انہوں نے اپنے کام میں اسے خرچ کر دیا۔

منشی عبدالغفور خاں کو جب اس کا ہم ہوا تو انہوں نے میری کوئی شکایت نہ کی کیونکہ وہ برسوں میرے گھر رہے تھے۔ اور مجھے اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور میں نے جرات بھی اسی بھروسے پر کی تھی تاہم دوسرے لوگوں نے مجھے ضرور لعن طعن کیا۔ اس وقت میرے پاس اتنی گنجائش بھی نہ تھی کہ انہیں دس روپے دے سکتا۔ پورٹ بلر پہنچنے کے بعد میرے ہاتھ میں روپیہ آیا تو میں نے انہیں فوراً جیل میں بھیج دیا۔

اپنے نفس کے ان دو عیوب کے اظہار کے بعد میں اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے صاف فرمادے اور میری حشر میں نیکوں کے سامنے دلیل نہ کرے۔

جن دنوں ہم نے چیف کورٹ پنجاب میں اپیل دائر کر رکھی تھی، ہمارے وکیل مسٹر پلوٹن نے یہ خبر دی کہ اگر تم اپیل کر کے چیف کورٹ پنجاب سے رہا نہ ہوئے تو انگریزوں کا ارادہ ہے کہ وہ مولانا احمد اللہ صاحب کو بھی گرفتار کر لیں گے؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب ہماری اپیل مسترد کر دی گئی تو انگریزوں نے سکسلا پڑھا کر ہمیں مولانا احمد اللہ کے خلاف جھوٹے گواہ بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

تحصیلدار میر مجیب الدین ساکن نارنول، جو رشوت ستانی کے قصور میں انبالہ جیل میں

۱۲۲۳ھ میں مولانا امجد اللہ بخش کی ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ کا اسم گرامی احمد بخش تھا جسے حضرت سید احمد شہیدؒ نے احمد اللہ سے بدل دیا تھا۔ مولانا ولایت علیؒ اور مولانا منور علیؒ آرومیؒ سے کسب فیض کیا۔ آپ کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد انگریز بہادر نے ضبط کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دی تھی، اہل و عیال کو مین عید کے دن بے خانمان کر دیا گیا تھا۔ اسی داستان خرنچکان کو آپ کے صاحبزادے مولانا حکیم عبدالحمیدؒ (۱۳۲۳ھ) نے مثنوی شہر آشوبؒ کے نام سے نظم کیا تھا۔ مولانا احمد اللہ صاحب کو بھی جیس دواںم بعبور دریا شہر کی سزا ہوئی تھی۔

یوٹھا، انگریزوں نے اس سے وعدہ کیا کہ اگر تم ان گیارہ آدمیوں میں سے کسی کو مولانا احمد اللہ کے خلاف گواہ بنا دو تو تمہارا قصور معاف کر کے تمہیں دوبارہ تحصیلدار بنادیا جائے گا؛ چنانچہ اس نے اپنی ذیوی بھلائی کے لیے کارروائی شروع کر دی۔ ہمیں جب اس کا علم ہوا تو ہم نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ بھائیو! ”ہماری دنیا تو خراب ہو گئی ہے اب فقط دین باقی رہ گیا ہے۔ خدا جھوٹے گواہ بن کر اسے نہ بچاؤ۔ کہیں ہماری مثل بھی وہ نہ ہو جائے کہ جٹ دونوں طرف سے گئے پانڈے، اودھ ملوانہ اودھ رانڈے

اس کی دن بھر کی ترفیب سے جس قدر اثر ہوتا وہ ہماری تھوڑی سی نصیحت سے زائل ہو جاتا تھا۔ اس لیے اس نے انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب تک اس جیل میں محمد جعفر اور مولانا علی صاحب موجود ہیں، کوئی گواہ نہیں بن سکتا؛ چنانچہ مجھے مولانا صاحب اور میاں عبدالغفار اسٹریٹل جیل وچور روانہ کر دیا گیا اور محمد شفیع، عبد الکریم، الٹی بخش اور منشی عبدالغفور وغیرہ کو نابالہ جیل ہی میں رہنے دیا۔ ہمارا اس جیل سے روانہ ہونا ہی تھا کہ محمد شفیع اور عبد الکریم وغیرہ سرکاری گواہ بن گئے اور ان کی جھوٹی شہادت کی وجہ سے وقت کے ولی اللہ، شمس الاسلام حضرت مولانا احمد اللہ صاحب کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی اور مئی ۱۸۶۵ء میں انہیں جس دوام بھودریلے نرور کی سزا دی گئی؛ چنانچہ آپ جن میں ہم سے بھی پہلے انڈمان تشریف لے گئے۔

یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ پہلے محمد شفیع کو کس قدر شدید غصہ کے ساتھ چھانسی کا حکم دے کر اس کی پچاس لاکھ کی جائیداد ضبط کی اور پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا جیل کر کے اسے بڑا کر دیا تاکہ ضبط شدہ جائیداد واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ بے قصور تھا جب تک ایک

آپ نے بھی مسلسل اٹھارہ برس جزائر انڈمان میں غریبی و اسیری میں گزارے۔ ملاحظہ فرمائیے تذکرہ صادقہ ص ۴۲، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۰۷، ۱۲۰، ۱۵۱، سرگزشت مجاہدین ص ۳۷، ۳۸، ہندوستان میں پہلی تحریک ص ۷۵ - ۲۸۰ لے آپ نے ۱۸۶۵ء کو انڈمان میں قید ہو کر فرمایا

سال بعد کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے، تو بڑے شد و مد کے ساتھ اس کی جائیداد کی ضبطی اور پچاسی کی سزا کیوں تھی؟ اور اگر وہ بہت بڑا محرم تھا، جیسا کہ سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں مندرجہ بالا سے ثابت کیا تو ایک سال کے بعد رہائی کیوں؟

اس کے بعد ۱۸۷۱ء تک امیر خاں صاحب سوداگر چرم، مولوی تبارک علی صاحب مولوی امیر الدین صاحب ساکن ٹینر، بنگال اور ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور وغیرہ دہلیوں کی گرفتاری کے جس قدر مقدمات پیش ہوئے، ان سب میں ان سرکاری گواہوں کو جھوٹی گواہی دینے کے لیے بلایا جاتا تھا اور میں نے خود ان گواہوں میں سے ایک کی زبانی سنا تھا کہ جب کبھی ہم جھوٹی گواہی دینے سے انکار کرتے ہیں تو ہمیں کہا جاتا ہے کہ تمہیں تو مشروط طور پر صرف اسی لیے رہا کیا گیا تھا کہ تم بوقت ضرورت گواہی دے سکو۔ یاد رکھو اگر تم نے گواہی دینے سے انکار کیا تو تمہیں پہلے وارنٹ پر ہی جیل سے دوام کی سزا دے کر کالا پانی بھیج دیا جائے گا۔

انبالہ جیل سے لاہور جانے کے لیے جب میں تیار ہوا تو بیوی بچے ملاقات کے لیے جیل میں آئے۔ جس دن

اہل و عیال سے ملاقات

ملاقات ہوئی رمضان المبارک کا مہینہ اور میں روزے سے تھا۔ جیل سے باہر ایک کوٹھڑی میں بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میرا گرو رنگ کا لباس، کمبل کا کڑتہ اور پاؤں پابند زنجیر و سلاسل دیکھ کر میرے یہ اقربا نہایت غمگین و اندوہ مند ہوئے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور ہر حال میں داناں ایمان و صبر، مضبوطی سے تھامے رکھنے کی تلقین کی۔ کوئی سال سوا سال کے بعد آج جب میں نے اپنے بیٹے محمد صادق کو دیکھا، تو وہ ایسا صحت مند تھا کہ میں اسے مشکل سے پہچان سکا۔ اس سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے دوبارہ اس دنیا میں نہیں دیکھا۔

۲۲ فروری ۱۹۶۵ء کو ہم لاہور جیل کی طرف روانہ ہوئے جو گیارہ گرو رنگ والی لباس زیب تن، کالا کلاں اوڑھے ہوئے

لاہور جیل کی طرف روانگی

بیٹری و مشینوں کے زیور سے آراستہ و پیراستہ منزل در منزل اور کوٹج در کوٹج یہ قافلہ عشاق

سوائے منزلِ روہں دولہی تھا۔ چالیس چالیس قیدیوں پر مشتمل یہ قافلہ تھا۔ ایک دو گاڑیاں بھی ساتھ تھیں۔ سب پیدل چل رہے تھے البتہ کوئی تھک جاتا تو اسے گاڑی پر سوار کر لیا جاتا ورنہ سب کے سب پاپیادہ خٹخال چھن چھتا تھے عجیب شان بے نیازی سے پہنے جاتے تھے۔ برس سوا برس کے بعد جو باہر کی ہوا کھائی تو طبیعت نہایت خوش ہوئی، راستے میں جو چاہتے خرید کر کھاتے جاتے تھے۔ سفر میں سب سے بڑی نعمت مولانا یحییٰ علی صاحب کی مصاحبت تھی، جس کے باعث سفر میں بھی دن عید اور رات شبِ برات ہو گئی تھی۔

قدرت کی کرشمہ سازیاں ماضی کے جن دن ہم نیا گروالباس پہن کر منزلِ اقل سے روانہ ہوئے، مہاراجہ ہندروالی پٹیل کی برات اسی راستے سے عین ہمارے سامنے سے گزرتے ہوئے، بڑی دھوم دھام کے ساتھ جنوب سے شمال کو جا رہی تھی، سورج طلوع ہو رہا تھا، صبح کا سماں وقت تھا اور فردری کے آخر کے گلابی جازے تھے۔ ایک طرف سوچ کی کمرلوں میں برات کے سونا چاندی، تاشیں بادل اور ہیرہ مرصع کی چمک، دوسری طرف ہماری لمبے کی بڑی اور ہتھکڑی کی دمک، ادھر دو شالوں اور کچھ اب و بانات کا رنگ، ادھر ہمارے جو گلاب لباس کی سُرنی اور سیاہی کا ڈھنگ، ادھر ہاتھی اور گھوڑوں کی ہٹکار، ادھر ہماری بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھٹکار ایک دوسرے کے مقابل، اس دنیا فانی کی عزت و ذلت اور مدارج کی کمی بیشی کا فرق عجیب خوبی سے دکھلا رہی تھی۔ لیکن یہ اس وقت اس راجہ نے ہمیں بڑی چشمِ حقارت سے دیکھا ہو لیکن میری ہندوستان واپسی سے بہت برس قبل وہ راہی ملکِ بقا ہو گیا تھا۔ اس کی طرف امیر و فقیر دونوں اسی طرح خالی ہاتھ جاتے تھے، جس طرح اس دارِ فنا میں خالی ہاتھ آتے ہیں۔ افسوس کہ اُس راجہ نے اس عروسِ دنیا سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا، جس کے لیے اس قدر دھوم دھام کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم جو ایک مدتِ دراز کے بعد جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکل کر باہر کھلی فضا میں پہنچے، تو ہمیں بھی مہاراجہ پٹیل کے براتیوں سے کم خوشی نہ ہوتی ہوگی۔ ہم ہرنوں کی طرح چوڑیاں

بھرتے چلے جا رہے تھے۔ جن قیدیوں کے پاس کچھ نقدی تھی، وہ راستے میں بوجاہتے خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ہم لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر ہونے ہوئے لاہور پہنچ گئے۔ آخری منزل لاہور تھی۔ جب شالامار باغ کے سامنے پہنچے تو ہر ایک نے اپنا اپنا من بھر کر بوجاہ سوکھایا کیونکہ جیل کی کال کوٹھڑیوں میں معمولی کھانے کے علاوہ اور چیزیں ملنی محال بلکہ حرم تھیں۔

تین بجے شام کے قریب ہم سینٹرل جیل لاہور کے دروازے پر پہنچے۔ دروازہ پر ہمارے چالان کے تمام قیدیوں کو ایک قطار میں بٹھا دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا، جس نے ہم سب کو بغور دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ پھر ڈاکٹر گرے پرنٹنٹ جیل آئے۔ اس نے بھی سب سے پہلے ہمارا ملاحظہ کیا اور پھر بڑے غصے سے حکم دیا کہ ان کے پاؤں میں ایک آرڈنڈ ابھی ڈال دینا چاہیے؛ چنانچہ اس حکم کے صادر ہونے کے ساتھ ہی دوبار آہنی ڈنڈے لے کر حاضر ہو گئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان ایک فٹ پانچ گز لمبا آرڈنڈ ڈال دیا گیا۔ ازراہ تعصب یہ ڈنڈا صرف ہمارے لیے ہی تھا ورنہ جیل میں ہم نے اور کسی قیدی کے پاؤں میں نہیں دیکھا۔ اس ڈنڈے کی وجہ سے چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی نہایت محال تھا۔

اس جیل کے درمیان میں ایک برج تھا اور اس کے ارد گرد آٹھ علیحدہ علیحدہ باکیں، صحن اور آٹھ مختلف

سینٹرل جیل لاہور

بنا ہوا تھا۔ پرنٹنٹ نے حکم دیا کہ اس مقدمہ میں ملوث تمام قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ کمرے میں بند کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے سے ملنے نہ پائیں۔ اس دن دوستوں سے جدا ہونے کی اذیت، آہنی ڈنڈے سے بھی بڑھ کر محسوس ہوئی۔ مجھے ان بارکوں میں سب سے زیادہ سخت نمبر اول میں لے گئے لیکن تا ئید غیبی سے ۶ بجے شام یہ حکم پہنچا کہ یہ قیدی انہالہ کے بیمار والے جیل سے آئے ہیں لہذا انہیں دوسرے قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے، تاکہ بیماری اس

جیل میں نہ پھیلے۔

اس حکم کے بعد بارک نمبر ایک کو، جہاں مجھے رکھا گیا تھا، میرے تمام ساتھیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ہم سب دوستوں کے اس اجتماع پر بہت خوش ہوئے اور حکمت الہی اور اس کے اسرارِ نہاں پر سجدۂ شکر بجالائے۔ اس بارک کا ہمدرد چونکہ ایک مسلمان تھا لہذا ہمیں کارخانہ مشقت میں بھی کسی کام پر نہ لگایا گیا بلکہ اللہ کا فضل شامل حال ہوا اور سپرنٹنڈنٹ نے خود مجھے اس نمبر کا مفتی مقرر کر دیا مگر وہ ڈنڈا جو غالباً کسی بڑے حاکم کے حکم سے تھا بدستور زیب پارا۔ جب ہر روز صبح کے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب آتے اور مجھے ہر قیدی کی مشقت کا حساب دکھانا پڑتا تو مجھے ہرن کی طرح اچھل اچھل کر ان کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ اتوار کے دن میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سپرنٹنڈنٹ صاحب ہمارے نمبر میں پیچھے اور تمام قیدیوں کی تلاشی کا حکم دیا۔ نیچے بعد دیگرے سب کی تلاشی ہوئی۔ جب میرے بستر کی تلاشی ہوئی تو اس میں سے تھوڑا سا پسوا ہوا نکلا۔ یہ ایسا قصور تھا کہ اس کی پاداش میں کوڑوں کی سزا دینا چاہیے تھی۔

جب برآمد شدہ نمک سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوا، تو میں جی ان تھا کہ کیس کا اب دونوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ضدل نامی ایک مسلمان قیدی جو انبلا جیل سے میرے ساتھ تھا اور میری خدمت کیا کرتا تھا، کہنے لگا کہ یہ بستر اور نمک، تو میرا ہے، مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا یہ کیسے؟ اس نے کہا کہ حضور کے تشریف لانے سے پہلے میں اور مولوی صاحب پشیا ب کرنے کے لیے بیت الخلاء میں گئے تھے کہ اسی اشار میں آپ آ گئے۔ ہم جلدی جلدی جو دوڑ کر آئے تو گھبراہٹ میں ایک دوسرے کے بستر پر بیٹھ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ یہ بیان سن کر بہت ہنسنا اور کہنے لگا کہ تم مولوی صاحب کو بچانا چاہتے ہو۔ اس کے بعد نمبر سے باہر جہاں کوڑے لگائے جاتے تھے ہم دونوں کو لے لیا۔ دوسرے

جن قیدیوں کے بستر دس سے کچھ کھانا انہیں کوڑے لگے شروع ہوئے، جب سب کو کوڑے لگ چکے تو پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر ضدل سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ سزا ہے کہ یہ ٹھک اور بستر تیار ہے، مولوی صاحب کا نہیں، اس نے کہا جی ہاں! ٹھک اور بستر تو میرا ہے، آگے آپ کو اختیار ہے۔" یہ جواب سن کر اس نے ہم دونوں کو بری کر دیا اور کچھ سزا دی اور ضدل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ اچھا اگر تم مولوی صاحب کو بچانا چاہتے ہو تو ہم نے تم کو بھی معاف کر دیا۔ آئندہ محتاط رہنا۔

کراچی کو روانگی

اکتوبر ۱۹۶۵ء کے آخری ایام تھے کہ قیدیوں کا ایک بڑا بھاری جالان کیا گیا اور انہیں ملتان روانہ کرنے کے لیے بندوبست کیا جانے لگا اور ایک تھکرملی دو دو قیدیوں کے ہاتھوں میں لگا دی گئی۔ سب سے سنبھلی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا دایاں ہاتھ تھکرملی میں ڈلوایا۔

ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی یعنی میں، مولانا کھلی علی صاحب اور میاں عبدالغفار ملتان روانہ ہوئے۔ روانگی کے دن کیفیت یہ تھی کہ سنٹرل جیل سے لاہور ریلوے اسٹیشن تک پاؤں میں بڑھی، سر پر بستر، جسے ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں تھکرملی کی گھجورٹ، اس پر سپاہیوں کی ڈانٹ ڈپٹ سننا کہ جلد کی سرسبز کرنا ورنہ ریل چھوٹ جائے گی۔ بہر کیف جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو ہمیں ریل کے ڈبوں میں بند کر کے۔ واٹنوں پر قفل چڑھا دیے گئے اور راستہ میں دروازہ کو کھین نہ کھولا گیا۔ گریہ جانوروں بائال کی طعنے گاڑیوں میں بھر دیا گیا۔

ملتان میں

رات کے آٹھ بجے کے قریب ہم ملتان پہنچے۔ رات کی تاریکی میں پر بستر اٹھائے ہوئے، اسٹیشن سے جیل کی طرف کشا، کشا، چل دیئے، جہاں جانوروں کی طرح بے آب و دانہ ہی بند کر دیئے گئے۔ ہم دو دن ملتان جیل میں رہے لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شرکد مرتب ہے؟ بازار کہاں ہے؟

۱۰ دن کے بعد ہمیں قتان سے قریباً پانچ سہیل کے فاصلے پر دریا کے سندھ کے کسی تپن یا ٹھاٹ سے الگ ہو گئے۔ سوار کرایا اور اس میں قطار در قطار بٹھایا گیا۔ بیڑی، ہتھکڑی اور ڈونڈ تو پہلے سے زیب تن تھے، یہاں ایک بڑی موٹی آہنی زنجیر بھی ہماری بڑیوں کے درمیان پھنسا دی گئی، جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ پاخانہ پیشاب بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے کئے کرتے رہے۔ اس وقت قریباً آدھا آدھا سن لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ اگرچہ دریا کے سندھ ہمارے زیر پاٹھا ٹھہرے مار رہا تھا لیکن ہم اس قدر مجبور و بے بس تھے کہ غصہ کرنے کی بھی توفیق نہ تھی لہذا پڑے پڑے تیم سے نمازیں پڑھتے تھے۔ گو ہم یہاں جکڑے پڑے تھے لیکن جیل سے نکل کر دہنتوں کی مصاحبت، آبِ دریا کی روانی اور اس پاس کے جنگلوں کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ کر نہایت خوش تھے۔

اسی کیفیت میں پانچ چھ روز کے بعد کوٹری پہنچ گئے۔ راستے میں سکھر، بھکر اور ٹھٹھے کے مشہور و معروف قلعے بھی دریائے سندھ کے کنارے نظر آئے۔ کوٹری کے سامنے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے، سندھ کا مشہور شہر حیدر آباد بھی دیکھنے میں آیا۔ اسی دن کوٹری سے بذریعہ ریل کراچی پہنچ گئے۔ کراچی میں منشی اور کلرک بڑی بڑی اونچی ٹوپیاں اور ہندو مہاجن بڑی بڑی اونچی بچڑیاں پہنتے تھے۔

جب انبالہ جیل سے روانہ ہوئے تو خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں ہر جگہ اردو یا فارسی کا دفتر ہو گا اور ہم منشی گری میں محال کی وجہ سے محوری کے کام میں رہ کر قید میں آرام سے رہیں گے۔ یہ خیال باطل اس قدر مسلط تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا مطلق خیال نہ رہا اور اس کا احساں اس وقت ہوا، جب یہ دیکھا کہ اردو اور فارسی کا دفتر قتان تک ہے۔

سندھ میں ہر جگہ دفتری زبان سندھی تھی۔ سندھی زبان کے حروف اگرچہ فارسی جیسے ہیں لیکن اس کے باوصف ہمارے لیے اس زبان کو سمجھنا نہایت دشوار تھا۔ گویا سندھ میں ہمارا شمار ناخواندہ لوگوں میں ہونے لگا اور وہ جو منشی گری کا غرور تھا یا غیر اللہ پر بھروسہ تھا، خود بخود ختم ہو گیا۔

کراچی جیل میں

کراچی جیل نسبتاً آرام دہ تھی، یہاں پہنچتے ہی ہتھکڑی اور آڑے ڈنڈے سے نجات مل گئی فقط آہنی بڑی زیپ تن رہی۔ یہاں قیدیوں کو رات کے وقت بند بھی نہیں کرتے تھے، بلکہ انہیں اجازت تھی کہ کھلی فضا میں چٹائیوں پر جہاں چاہتے سو جاتے۔ پریڈاز جیل کی تفصیل پر گشت کرتے رہتے تھے۔ دو برس کے بعد یہاں پہلی مرتبہ دسکے موتیوں سے جڑے سیاہی مائل نیلگوں آسمان کے نیچے سوئے دیگر جیل خانوں کی نسبت یہاں قیدیوں کو نہایت عمدہ کھانا ملتا تھا۔ گھی سے چڑی ہوئی گندم کی ڈٹیاں عمدہ ترکاری اور گوشت کا مناسب انتظام تھا لیکن آرام کے یہ دن جیسے پاک جھپکتے گزر گئے۔

صبح سفر، شام سفر

ایک ہفتہ کراچی ٹھہرے، آٹھویں روز ہمیں بحری جہاز میں بوریوں کی طرح بھر کر بمبئی بھیج دیا گیا۔ بادبانی جہازوں اور سمندر کا نظارہ ہم نے سب سے پہلے کراچی میں دیکھا۔ جہاز چرکہ بہت چھوٹا تھا اور قیدیوں کو تہ خانے میں بھر دیا گیا تھا، اس لیے سب کی زبان پر تھا ہے

جائے تنگ است مرداں بسیار
و تنہا رہنا عذاب النار

لنگر اٹھا کر جہاز ابھی تھوڑی دور سمندر میں گیا تھا کہ دریا کے تلاطم اور موجوں کی طغیانی کی وجہ سے ڈنگمانے لگا، جس سے قیدیوں کو قے اور تلی شروع ہو گئی۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک دوسرے کے اوپر ہی قے کی جباری تھی، جس سے تھکافت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جہاز میں کچھ مسلمان بھی سوار تھے جو قیدی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیں مولوی سمجھتے ہوئے بڑی تواضع کی دو تین روز کے بعد بڑی مشکلات برداشت کرتے ہوئے، ہم بمبئی کی بندرگاہ میں داخل ہوئے وہاں میلوں تک ہزاروں جہاز کھڑے تھے بلکہ جہازوں کی کثرت کے باعث سمندر جہازوں کا جنگل معلوم ہو رہا تھا۔

بہانہ ہے اترے تو ہمیں بذریعہ ریل بمبئی کے جیل خانہ میں لے جایا گیا، جو کہ وہاں سے

بارہ میل تھا۔ بجٹی میں پارسی مرد عورتیں کبھرت دیکھنے میں آئیں۔ یہ لوگ بڑے خوبصورت اور مالدار تھے اور آتش پرست زردشت کی امت سے تعلق رکھتے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ کی چڑھائی کے وقت ایران سے بھاگ کر ہندوستان کے اس حصہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ جہاں تک ہیں دیکھنے کا موقع ملا بھٹی شہر بھی ایک ٹاپو ہے۔ ایک بند باندھ کر اسے براعظم ہند سے ملا دیا گیا ہے۔ بجٹی اور تھانہ کے درمیان سمندر بہتا ہے، اس کے پانی کو کھیتوں اور کیریوں میں روک دیا جاتا ہے۔ سمندر کا ٹکلیں پانی جب سورج کی حرارت سے خشک ہوتا ہے، تو وہ خود بخود عمدہ نمک بن جاتا ہے۔ ریلوے لائن کے کنارے ہزاروں من نمک کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ناریل کا درخت اور اس کا تازہ پھل بھی ہم نے پہلے پہل بجٹی میں دیکھا۔ بجٹی کی عورتیں اپنی ساڑھی کو ایسے باندھتی ہیں جیسے مرد دھوٹی کو۔ یہاں کے ہندو بڑی بڑی گڑیاں استعمال کرتے ہیں، جو سر پر ایک ٹوکرے کی طرح رکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس علاقے کی زبان گجراتی یا مرہٹی ہے۔ جب ہم ریل سے اتر کر تھانہ کے بازار میں جیل کی طرف پیدل جا رہے تھے، تو ہمارے چند قیدی ساتھیوں نے کچھ مٹھائی کی دوکانوں کو لوٹ لیا اور بے محابا مال مسروقہ کھانا شروع کر دیا۔ دوکاندار انہیں قیدی سمجھ کر خاموش ہو رہے بلکہ بعض دوکاندار تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے قیدیوں کے منہ میں مٹھائی پڑنے کو بڑا پسند کیا۔

تھانہ جیل

چلتے چلتے شام کے قریب ہم تھانہ جیل کے دروازہ پر پہنچے۔ جیل کی سرہٹوں کے وقت کا ایک بڑا مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا، جس کے چاروں طرف ایک بڑی گہری اور بچتہ خندق بنی ہوئی تھی۔ جیل میں داخل ہوتے ہی ہمساری تلاش ہوئی اور ہم سب کے جوتے اتروا لیے گئے، جنہیں جاتے وقت بھی واپس نہ کیا گیا۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ کسی دل جلے قیدی نے داروغہ جیل کو جوتے مارے تھے، جس کی وجہ سے یہاں یہ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی قیدی جیل میں جوتا پہننے بلکہ گتے یا زور سے تاکہ کوئی دوبارہ ایسی نامعقول حرکت نہ کر سکے۔

رات کو ہمیں جوار کی دو دو روٹیاں اور تھوہر کی دال دے کر علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ تائید الٹی کے باعث دوسرے دن پنجابی قیدیوں کو گندم خور علاقے کے باشندے سمجھتے ہوئے گندم کی روٹیاں ملنے لگیں اور اس کے بعد تو یہ قانون بنادیا گیا کہ پنجاب کے قیدیوں کو یہاں گندم ہی کی روٹی دی جائے گی۔ صبح ہوئی تو ہمیں پتھر توڑنے کی مشقت دی گئی، جسے بشکل تمام ایک دو دن کیا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد یہاں درمیانی کام بھی شروع کر دیا گیا۔ پنجابی قیدی اس کام کے مستمقر ہوئے انہوں نے مجھے اور مولانا کبھی علی صاحب کو درمیانی باؤں کا استاد ظاہر کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور اس طرح ایک مہینہ بڑے آرام سے گزرا۔

بھٹی کی طرح اس جیل میں بھی مرہٹی زبان کا دفتر تھا۔ اردو اور فارسی ٹاں یہاں بھی ناخواندوں میں شمار ہوتے تھے۔ کراچی اور تھانہ کے دفاتروں کا حال دیکھ کر یہیں یقین ہو گیا کہ اب باقی عمر ہم ناخواندوں میں شمار ہوں گے اور قلم پڑھنے کی نوبت شاید ہی کبھی آئے۔ اس جیل کا داروغہ ایک برہمن اور بڑا متکبر آدمی تھا مگر نائب داروغہ ابراہیم مسلمان تھا اور حتی المقدور ہماری بڑی تواضع کیا کرتا تھا۔ ایک مہینہ گزارنے کے بعد یہاں سے بھی کوچ کی تیاری ہوئی۔ اس مسلمان نائب داروغہ نے ہماری بھاری بیڑیاں اتر وادیں اور ان کی بجائے ہلکی بیڑیاں ڈلوادی تھیں۔ ہندوستان کے جیل خانوں میں ایسی لوگوں خصوصاً شریفوں کو بڑی مشکل ہے مگر کوٹ پٹن والے کی بڑی عزت ہے خواہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی باشندے، دونوں کو صاحب لوگوں کی طرح بڑا چین ہے۔

جناباز ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بھٹی سے کالا پانی روانہ ہوا۔ یہ جہاز انگلینڈ کا بنا ہوا تھا۔ تمام عملہ بھی انگریزوں پر مشتمل تھا۔ جب جہاز نے لنگر اٹھایا، تو عرشے پر کھڑے ہوئے تمام اسیرانِ بلائے مادر وطن پر آخری محبت بھری نظر ڈالی۔ کچھ قیدی ایسے بھی تھے جن کی محبت کا محور، گھر بار، کھیتی باڑی، ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد تھی اور انہیں یہ خیال بھی شدت سے ستا رہا تھا کہ وہ جیتے جی اپنے اعزاء و اقارب پیاروں

راج دلاڑوں اور سرسبز و شاداب کھیتوں کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ — لیکن ان میں سے کچھ نیک بخت ایسے بھی تھے جن کے حاشیہ خیال اور قلب و نگاہ کے کسی گوشے میں بھی ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ ان کی محبت کا مرکز و محور صرف وہ دعوت حق تھی، جس کے لیے انہوں نے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کر دیا تھا، وہ اپنی کشتیاں ہلا کر آ رہے تھے، انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ وہ ایک ایسی بھیاں تک جگہ جا رہے ہیں، جہاں کے شب در روز نامعلوم کتنے کرناک ہوں گے۔ انہیں خیال تھا تو صرف اس تحریک کا جسے وہ خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر سیراب کر رہے تھے۔ جب تک ساحل نظروں سے اوجھل نہ ہوا، قیدی اپنے اپنے خیالات میں گم غم حیرت کی تصویر بنے اُسے تکتے رہے۔ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو کتنے ہی دلوں سے اٹھنے والادعاواں، عارض کے زمر میں پہنچ کر پانی کے قطرات کی صورت اختیار کر گیا۔ اب وہ تھے، ان کے زہر ساز پرشہنم کے قطرات جیسے آنسو یا پھر چار سو تہہ نظر تک پھیلا ہوا سمندر کا پانی۔ ان کے جذبات کی طرح سمندر بھی رفتہ رفتہ طغیانی رنگ اختیار کرتا گیا۔

درا کو اپنی ظنیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو، یا درمیاں رہے

سمندر کی تلاطم خیزیوں کے باعث اکثر قیدی ہمارے پڑ گئے، ایک بے پارہ پنجابی قیدی داغ مفارقت بھی دے گیا۔ انہیں قاعدہ شریعت کے مطابق اسے غسل دیا، کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھ کر اس کی لاش کے ساتھ بہت سے پتھر باندھے اور اسے سمندر میں پھوڑ دیا۔ سیلون پہنچے تو سمندر کا تلاطم مزید شدت اختیار کر گیا۔ سینکڑوں ٹن وزنی جہاز، ایک ننھے سے جہاز کی گیند کی طرح پانی کی سطح پر اچھل رہا تھا۔ پہاڑ کی طرح دیو قامت اور بلند بالا موتیوں ایک طرف سے آتیں، کبھی دوسری جانب سے اور اسے بری طرح ہلا کر رکھ دیتیں۔ کبھی اوپر سے گزرتی تھیں اور کبھی نیچے سے اور یوں معلوم ہوتا کہ جہاز ابھی غرق ہو جائے گا۔ نوب کے مارے لوگوں کا بڑا حال تھا۔ وہ چیخ بریخ کر خد کو پکار رہے تھے۔ آخر کار کئی گھنٹے بعد طوفان تھا اور لوگوں کی جان میں علان آئی۔

۳۴ ویں دن ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو جہاز قبل از دوپہر پورٹ بلیرانڈ مان پہنچ گیا۔ انبالہ سے لے کر انڈمان کے پانیوں میں داخل ہونے کی کل مدت ۱۱ ماہ ہے۔ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے برے بھرے جزیرے دور سے پھیلی ہوئی گہری سبز چادر کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ اب ساحل بھی نظر آ رہا تھا۔ قیدیوں کی ایک جماعت عرشے پر اکڑ کھڑی ہو گئی۔ دور سے سمندر کے کنارے کے کالے کالے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے بھینسیوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں بکھر رہے ہوں۔ ایک کشتی میں پورٹ بلیر کے محافظ آپہنچے اور جہاز لنگر انداز ہو گئے۔ میں نے ایک ہندوستانی ملاج سے پوچھا کہ یہاں منشی اور محرموں کی بھی کچھ قدر ہے یا نہیں؟ دوسرا سوال میں نے یہ پوچھا کہ یہاں کا دفتر کس زبان میں ہے؟ اس نے قرینہ سے معلوم کرایا کہ یہ شخص منشی ہے، چنانچہ اس نے میری تسلی کے لیے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کے حاکم اور مالک تو منشی ہی ہیں۔ یہ مژدہ سن کر مجھے بھی کچھ تسلی ہوئی۔

جہاز لنگر انداز ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی بڑی کشتیاں پہنچ گئیں۔ تمام قیدیوں کو ان میں بٹھا کر انڈمان کے صدر مقام روس کی طرف روانہ کر دیا۔ ساحل سمندر پر ایک جم غفیر کھڑا تھا، وضع قطع سے سب لوگ پڑھے لکھے مولوی اور منشی معلوم ہوتے تھے۔ بیسیوں لوگ سفید فافرانہ لباس زیب تن کیے، ہمارے منظر کھڑے تھے۔ ابھی ہم کشتی میں سواری ہی تھے کہ کنارے پر کھڑے ایک آدمی نے بلند آواز سے پوچھا :-

”محمد جعفر اور مولوی کئی علی صاحب بھی کس جہاز سے آئے ہیں؟“

”جی ہاں! وہ دونوں آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

یہ سننا تھا کہ وہ لوگ پانی میں کود پڑے اور ہم لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ کشتی سے نیچے اتار دیا۔

ساحل پر قدم رنجہ ہوتے ہی، سب سے پہلے

یہ خبر ملی کہ مولانا احمد اللہ صاحب چھ ماہ قبل

مولانا احمد اللہ سے ملاقات

۱۵ جن ۱۹۶۵ء کو یہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ انہی کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ آپ کو ہمارے

آنے کی خبر دو روز پہلے پہنچنے والے جہاز کے ان قیدیوں نے دی تھی جو تھانہ جیل سے بھبی تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

مولانا احمد اللہ، انڈمان کے چیف کمشنر میرٹھی سید البر زمان کے مکان پر مقیم تھے۔ بندرگاہ سے ہم سیدھے وہیں گئے۔ آپ کے ساتھ احمد بھی کئی معززین منتظر تھے۔ ملاقات کا یہ نظارہ بہت رقت انگیز تھا۔ مصافحے اور معافقے کے بعد بیڑیاں کاٹ پھینکی گئیں۔ عمدہ لباس پہلے سے تیار کرالیا گیا تھا۔ ہم نے گہرے کپڑے اتار دیئے اور نہادھو کر اسے زیب تن کر لیا، پھر دسترخوان بچھا دیا گیا، جس پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چھنے گئے تھے۔ تین برس بعد پہلی مرتبہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اگرچہ اسی تاریخ سے ہم قید سے رہا ہو گئے تھے اور پھر کبھی بارک، قیدیوں کا لباس یا قیدیوں کا کھانا نہیں دیکھا لیکن اس کے باوجود ہم اٹھارہ برس تک کالے پانی میں لمزموں ہی کی طرح رہے۔

اسی شام سے گھر گھر ہماری دعوتیں ہونے لگیں اور وہ دنیس اور عمدہ کھانے کھلانے گئے کہ ہندوستان میں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ساری عمر جیل کا کھانا کھانا پڑے گا۔ لیکن اس قادر مطلق جب یہاں نعم البدل عنایت فرمادیا، تو یہ خیال دل سے محو ہو گیا۔

جب اس جزیرے میں پہنچے تو دیکھا کہ ہزاروں قیدی مرد عورتوں کی پشیمانیوں کو کھود کر ان کا نام، جرم اور لفظ دائم الجس کندہ کر لیا ہوا تھا کہ وہ نوشتہ تقدیر کی طرح ساری عمر نہیں مٹ سکتا تھا لیکن مقام شکر ہے کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے کچھ عرصہ قبل تمام عملداری سرکار میں یہ حکم موقوف کر دیا گیا۔ ہم اس دائرہ دائم الجس سے محفوظ رہے۔

جزائر انڈمان خلیج بنگال کے مشرق میں ۹۲ درجہ ۴۷ دقیقہ طول شرقی اور ۴۳ دقیقہ عرض شمالی پر، گلگت سے چھ سو میل کی مسافت پر واقع ہیں۔ ایک ہزار جزیروں کا یہ مجموعہ ۷۴۶ میل کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ علم طبقات الارض کے

جزائر انڈمان

ماہرین کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ جزائر بڑے عظیم الشان تھے اور پھر حوادثِ زمانہ اور سمندر کی موجوں کے باعث اولاً بڑے عظیم ایشیا سے الگ ہو گئے ثانیاً ایک دوسرے سے بھی علیحدہ ہو گئے اور کچھ ٹپے ٹپے ہزاروں جزیروں میں تقسیم ہو گئے۔

گلات سے انگوٹ یہاں پانچ روز میں پہنچتا ہے اور رنگون سے تین روز میں۔ بولین یہاں سے تین میل مشرق شمال میں، سنگاپور چار سو میل مشرق و جنوب میں، پانگ تین سو پچاس میل مشرق میں، نکوباریا تین سو میل مشرق و جنوب میں، مدراس آٹھ سو میل مغرب میں اور لنکا آٹھ سو میل مغرب و جنوب میں واقع ہے۔ یہ سب جزائر پہاڑ ہیں، ہموار زمین بہت کم ہے۔ یہاں سب سے اونچا پہاڑ مونٹ ہریٹ ہے، جو سطح سمندر سے ۱۱۱۶ فٹ اونچا ہے۔

یہاں ٹپے پانی کا کوئی ندی نہ بارش نہیں ہے۔ موسمِ برسات میں بعض اونچے ٹیلوں سے پانی کے بھرنے بہا کرتے ہیں، لیکن ایسا خشکی میں بند ہو جاتے ہیں۔ کنوئیں وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ پورٹ بلیر کے زیریں علاقے میں گدھاک کا ایک پہاڑ ہے، جس سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلنے رہتے ہیں۔

یہاں کے جنگلات میں خنزیر کے علاوہ اور کوئی پتہ پایہ، درندہ یا پرندہ نہیں ہے۔ لہذا ابیل یہاں کا ایک عمدہ نفع ہے، جو قوتِ باہ کے لئے مایہِ سفقہ سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا ہے اور سونے پاندی کی طرح بہت گراں ہوتا ہے۔ جنگلات میں ہزار ہا قسم کی عمدہ اور پائیدار لکڑی موجود ہے اور ہمارے علاقے کی لکڑی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کئی قسم کا ہے اور اس کی لکڑی دیگر ممالک میں بطورِ نفع بھی جاتی ہے۔ کالی ناگنی کی طرح عقیق، البھر کی چھڑیاں، ہزار ہا قسم کی رنگ برنگ کی کوڑیاں اور طرح طرح کی، پتیاں یہاں کے سمندر سے نکلتی ہیں اور دوسرے ملکوں میں بطورِ نفع بھی جاتی ہیں۔

آسم، املی، جامن، کھٹل، بڑیل، بائیل اور پان وغیرہ گرم ملکوں کے درخت یہاں کے جنگلات میں خود بخود

پیداوار اور آب ہوا

اگے ہونے ہیں۔ جنگل کو صاف کر کے پچاس سو کاؤں آباد کیے گئے ہیں۔ ہر قسم کی ترکاری، گرم ملکوں کے پھل اور دھان، مکئی، جوار، مونگ، ماش اور میٹر وغیرہ کثرت سے یہاں پیدا ہوتے ہیں۔ سرد ملکوں کے آج گندم اور چنا وغیرہ بالکل پیدا نہیں ہوتے۔ اس کا حکومت نے انتظام کر رکھا ہے کہ وہ ملک سے گندم اور پھل وغیرہ لاکھ سات پائی فی پونڈ یعنی سو آن فی سیر کے حساب سے فروخت کرتی ہے۔ یہاں غلے کا ذخیرہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور اس ملک میں کبھی قحط بھی نہیں پڑتا۔

اس جزیرے کی آب و ہوا اتنی عمدہ اور صحت بخش ہے کہ روئے زمین پر اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہینڈ، پیچک، وبائی بخار اور آشوب چشم وغیرہ متعدی امراض یہاں بالکل نہیں ہوتے۔ میں برس کے عرصہ میں ہم نے نہیں سنا کہ کوئی آدمی ان میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہوا ہو۔ یہاں سراور کپڑوں میں بٹنیں بھی نہیں پڑتیں اور نہ ہی پستور اور مجر جیسے موذی جانور ہوتے ہیں۔ خط استوا سے قریب ہونے کے باعث یہاں بارش بکثرت ہوتی ہے اور دن رات برابر ہیں۔ سردی کی شدت ہوتی ہے نہ گرمی کی بلکہ سارا سال موسم معتدل رہتا ہے۔ دسمبر اور جنوری کی راتوں میں بھی صرف ایک چار اوڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سرمائی کپڑوں کا بالکل دستور نہیں، کوئی رضائی بناتا ہے، تلائی، روئی ہوتی ہے نہ دھنیا، خراں ہے نہ بہار بالکل سارا سال موسم معتدل رہتا ہے اور بارہ مہینے درخت، جگرے جبرے بہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ حکیم و علیم نے موسموں کو یہاں کے جنگلوں کی رعایت رکھتے ہوئے بنایا ہے، جو کہ ہمیشہ مادر زاد برہنہ رہتے ہیں۔ اگر گرمی سردی کی شدت ہو تو یہ برہنہ مخلوق خدا فوراً بلاک ہو جائے۔

مشرق و اس کثرت سے ہوتی ہے کہ سنی سے دسمبر تک پورے آٹھ مہینے بادل برستے رہتے ہیں۔ یہی وجہ کہ مکانوں کی چھتوں کو ڈھلوان وار بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کچی اور چوٹی چھتیں یہاں کی بارش کا یہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بارش تو موسلا دار ہوتی ہے لیکن او لے پڑتے ہیں، نہ کبھی آندھی آتی ہے

ان جزائر کے جنگلات نہایت گنجان اور دشتوار گزار ہیں۔ ان میں درخت اتنے اونچے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب کسی درخت کو کاٹ کر گرایا جاتا ہے، تو اس کی ڈالیوں اور شاخوں سے سیکڑوں گز تک زمین متاثر ہوتی ہے۔ یہاں کے سانپ اور کچھو میں زہر نہیں لیکن کنگھورے بہت زہریلے ہوتے ہیں۔

جنگلات میں زائد قدیم سے ایک وحشی اور ماد رزاد قوم آباد چلی آرہی ہے۔ مرد عورتیں بالکل کپڑا نہیں پہنتے اور نہ ہی انہیں کپڑا ملتا ہے۔ ان کا بھی تک صحیح حال بھی دریافت نہیں ہو سکا کہ وہ کس ملک سے اور کب آکر یہاں سکونت پذیر ہوئے ہیں؟ ہمیشہ سے وحشی چلے آ رہے ہیں یا کبھی مہذب بھی تھے؟ جیسا کہ مشہور تھیابہ جنگلی آدم خور نہیں ہیں۔ ان کے بدن پر بال بھی ہیں۔

انڈمان کی نوآبادی سو برس کے قریب پہلے، ایک جہاز ران لیٹیننٹ بلیر نے آکر یہاں سب سے پہلے لنگر ڈالا تھا۔ اسی وجہ سے اس جزیرے کو پورٹ بلیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی سرکار نے تجویز کیا تھا کہ قیدیوں کو یہاں بے ضرورت شوقیہ لگا دیا جائے گا لیکن یہ جزیرہ آباد ہو کر، آب و ہوا کے ناموافق ہونے کے باعث، ۱۸۹۶ء میں پھر اجڑ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرکار کو پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ اسے آباد کیا جائے۔ کیونکہ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے کئی ہزار ”باغیوں“ کو جیل میں رکھنا ممکن نہ تھا، چنانچہ مارچ ۱۸۵۷ء سے ”بندت“ کے جرم میں ماخوذ قیدیوں کو یہاں بھیج کر اس جزیرہ کو دوبارہ آباد کر دیا گیا ہے۔

اصلی باشندے شروع شروع میں جب قیدی یہاں آکر آباد ہوئے، تو مدت تک جنگلی لوگوں نے سخت مخالفت کی؛ چنانچہ

انہوں نے یہاں کے پہلے سپرنٹنڈنٹ اور کمشنر ڈاکٹر واکر کے عہد میں ایک بہت بڑی فوج ظفر مروج کے ساتھ ہوا اور ابرہہ میں پر حملہ کر کے بہت خون خرابے کیے تھے لیکن اب سرکار

کی حکمتِ علی اور علامت کے باعث فرمانبردار بن گئے ہیں اور بیکل یا بستی میں جہاں کہیں ملتے ہیں، بڑی خاطر داری سے پیش کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا قد چار سے پانچ فٹ چار انچ تک لمبا ہے۔ شکل و صورت میں بالکل جشیبوں جیسے ہیں۔ سیاہ خام، گول سر، آنکھیں مجھری ہوئیں، سر پر پھیر کے سے بال مگر نہایت مضبوط اور قوی، یہ ان کا علیہ ہے۔ کل جزائرِ انڈمان میں ان کی بارہ ذاتیں ہیں۔ ہر ذات کی زبان دوسری سے بہت کم ملتی ہے۔

یہ جنگلی اسل بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان میں رہتا ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے اور سب سے بڑا ہے۔

مذہبی خیالات

وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، آسمان میں اس کا نہایت عمدہ اور نفیس محل ہے، اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی کے گھر سے پانی برتا ہے، بجلی کا شعلہ اور کرڑک بھی اسی کے پاس سے آتی ہے، موت بھی اسی کے حکم سے ہوتی ہے، بھلائی اور رزق بھی وہی دیتا ہے، ان جنگلیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ چانا پاک اس کی بیوی ہے اور اسے بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے، وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔

یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے کہ سب بڑے کام شیطان کرتا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ شیطان دو ہیں ایک زمین کا جس کا نام ارم چوگلا ہے۔ جب زمین پر کوئی ناگہانی موت سے مر جاتا ہے، تو یہ سمجھتے ہیں کہ ارم چوگلا نے مار ڈالا ہے۔ ایک سمندر کا شیطان ہے جس کا نام جو رو وندلا ہے۔ جب کوئی ڈوب کر مر جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کو جو رو وندلا نے مار ڈالا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ مذکورہ نمونہ دونوں جنس سے ہیں جنگلی میں رہتے ہیں اور انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھوت پرست کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انہیں کچھ اختیار نہیں ہے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا کسی دوسری چیز کی قطعاً عبادت نہیں کرتے۔

یہ لوگ طوفانِ نوح کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمین پر ایسا طوفان آیا تھا کہ ساری دنیا ڈوب گئی تھی اور ان کے بزرگ ایک کشتی بنا کر اس میں سوار ہو گئے تھے اور ایامِ طوفان میں بہت دنوں تک اس کشتی میں سوار رہے۔ جب طوفان ختم ہوا تو وہ کشتی جزائرِ اندمان کے پہاڑوں میں سے کسی ایک پہاڑ پر آکر رک گئی تھی۔

سماجی زندگی

یہ لوگ دوسے زیادہ گنتی نہیں جانتے، جب دوسے زیادہ کسی چیز کی گنتی کرنی ہو، تو انگلیوں پر شمار کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مادرِ زاد برہنہ رہتے ہیں البتہ عورتیں اندامِ نہانی پر ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ مرد عورتیں جسم کے کسی حصہ پر بال رکھنے کے قائل نہیں جسم کے تمام بالوں کو بوتلوں کے ٹکڑوں کے ساتھ تراش ڈالتے ہیں۔

ان کے ہاں شادی بیاہ بھی نہایت سیدھے سادے طریقے پر ہوتے ہیں۔ شادی کے وقت دولہا اور دلہن دونوں کو گیر و رنگ کی چربی سے رنگ دیا جاتا ہے۔ شادی کے موقعہ پر قوم کے تمام افراد جمع ہوتے ہیں۔ اجتماع میں ایک آدمی بطور قاضی نظر آتا ہے، وہی دولہا کو اٹھا کر دلہن کے پاس لے جاتا ہے اور دولہا کے سامنے بہت سے تیر و کمان رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان سے شکار کر کے اپنی عورت کی پرورش کرنا اور بچہ وہی شخص بلند آواز کے ساتھ کہتا ہے ”آبِ اک“ یعنی لے جاؤ یہ تمہاری بیوی ہے۔ یہ کہنے کے بعد عقد پختہ ہو جاتا ہے اور پھر تاحیات دونوں کے ہاں طلاق ہے نہ جدائی۔ شادی کے بعد ان کے ہاں زنا بھی نہیں ہے۔

بچے کی پیدائش کے موقعہ پر بھی عورتیں پردے کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں بلکہ مردوں کے سامنے ہی بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ پیدائش کے بعد ایک عورت پتوں کے ساتھ مکھیوں کو دور کرتی ہے جبکہ ایک دوسری عورت نال کاٹ کر بچے کو گود میں لے کر بٹھ جاتی ہے۔ پہلے دن بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلاتی ہے لیکن دوسرے دن سے بچے کی ماں دودھ پلانے لگ جاتی ہے۔ وضعِ حمل کے فوراً بعد زچہ چلنے پھرنے لگ جاتی ہے، جنگل کی ہر چیز کھاتی پیتی ہے، ان کے ہاں کسی قسم کے پرہیز کا قطعاً رواج نہیں۔ بچہ جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے، تو نیز کچھ

اس کا پہلا کھیل ہوتا ہے ۔

ان لوگوں کا گھر بالکل چھوٹا سا ہوتا ہے ۔ صرف چار کنبے کھڑے کر کے ، ان پر پتے ڈال لیتے ہیں اور ایک چند روزہ آسرا بنا لیتے ہیں ۔ ان کے گھروں میں جا کر دیکھو تو میاں بیوی کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی ۔ تیرنگان ان کی اصل جائیداد ملک جہان ہیں ۔

یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بنا لیتے ہیں ، جن کے ذریعہ ایک جزیرہ سے دوسرے جزیرہ تک آتے جاتے ہیں ۔ یہ اپنے مردوں کی کھوپڑیاں بھی ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہتے ہیں کسی دوسرے جزیرہ سے جب کوئی ممان ان کے ہاں آتا ہے ، تو اسے پہلے گھر سے تھوڑے سے فاصلہ پر بیٹھنا پڑتا ہے ۔ گھر والے اسے وہاں کھانا پہنچاتے ہیں ۔ کرانا کھانے کے بعد وہ جس گھر میں چاہتا ہے چلا جاتا ہے ۔ پھر سب اس سے مل کر رہتے ہیں ۔

یہاں کے باشندے کھیتی باڑی بالکل نہیں کرتے اور نہ ناچ کھاتے ہیں ۔ ان کا کھانا پھل ، سمندر کے کیرن ، خشک ذرے ، پیسے وغیرہ ہیں ۔ آگ پر نیم بریاں کر کے نمک مرچ کے بغیر کھانے ہیں ۔ بھجور ، درختوں کی جڑیں ، پھلیاں ، بھل ، پتے ، سور کا گوشت اور شہد بھی ان کی خوراک میں شامل ہے ۔

غوطہ زنی کے یہ بچپن سے عادی ہوتے ہیں ، اس فن میں شاید دنیا کی کوئی قوم بھی سبقت نہ لے جاسکے ۔ یہ بلا کے تیر انداز ہوتے ہیں ، ان کا نشانہ بہت ہی کم خطا ہوتا ہے ۔ ان لوگوں میں کوئی حکم ناڈا کر نہیں ہوتا ، خون نکلنے ہی کو ہر مرض کا علاج تصور کیا جاتا ہے ، جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو وہ خود یا اس کا کوئی عزیز نہ نہایت بے درد سی اور انارڈی پن سے بوتل کے ٹکڑوں سے زخم کر کے خون نکال دیتا ہے ۔

جب کوئی مر جاتا ہے تو اسے ایک ڈگری میں رکھ کر ، اس کے گھٹنوں کو مروڑ کر اس کی چھاتی پر لا کر باندھ دیتے ہیں ، سارے اعصاب کو درخت کے پھلکوں سے کس دیتے ہیں اور پھر قبر کھود کر اس میں گلاش دیتے ہیں ۔ قبر کے نزدیک آگ جلاتے رہتے ہیں ۔ ایک دو ماہ کے

بعد اس کی قبر کو کھود کر اس کا ماتم کیا جاتا ہے اور اس کی ہڈیوں کو سب عزیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور پھر انہیں حرز جان سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں کبھی کبھی ہاشموں کو کاٹنے کے بجائے مچان پر رکھ دیا جاتا ہے یا درختوں کی شاخوں پر لٹکادیا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد آدمی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ دوبارہ زندہ ہونے، جزا سزا اور آخرت کے قائل نہیں ہیں۔

یہ لوگ ناچنے گانے کے شوقین ہیں گزنا چنے گانے کے آلات سے کیسرا آستان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں۔ ان میں کسی مذہبی سہارا یا رہنما کا بھی کوئی تصور نہیں، اس کے باوجود اخلاق، آدمیت، دیانت داری اور راست بازی کے اوصاف کے ساتھ متصف ہیں۔ ابتدا میں یہ لوگ روپیہ پیسہ کی قدر و قیمت سے ناواقف تھے۔ اگر کوئی شخص دینا تو لے لیتے اور پھر دیکھ بھال کر زمین پر چینیک دیتے تھے، مگر اب تو بہت لالچی ہو گئے ہیں اور راہ گیروں سے پیسہ پیسہ کا سوال کرتے ہیں۔

ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ لڑکیاں جلد بالغ ہو جاتی ہیں اور تیس سال کی عمر میں تو بہت بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ بہت عرصہ ہوا دو دھناتہ نامی ایک شخص نے ایک جنگلی عورت سے شادی کی تھی مگر ربائی ہو جانے کے باعث اس بے چاری کو یہیں چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک ان جزائر کی آب و ہوا سمجھ قاتل تھی جس کو زخم ہو جاتا تیسرے روز مر جاتا اور چوتھے روز مر جاتا۔ زخم کیا ہوتا تو یا پیغام ابل ہوتا۔ جب آبادی یہاں شروع ہوئی، تو ان دنوں مرض اسکروبی (SCORBUTUS) بھی بڑے زور سے پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک جہازی بیماری ہے، جس سے منہ پک جاتا ہے، پنڈلیاں سخت پتھر جاتی ہیں اور آدمی مر جاتا ہے، اس مرض میں مبتلا ہو کر یہاں ہزاروں آدمی راہ گزرنے آخرت ہو کر ہلاک ہوئے۔ ہمارے پہنچنے سے ایک سال قبل یہاں کی تمام بیماریاں ختم ہو گئی تھیں اب تو اب۔ اکی غنی گئے اعتبار سے یہ جزیرہ رشک کشمیر تھا، جہاں بیس برس تک ہمارے

میں درجی نہ ہوا اور قید کی زندگی بڑے آرام و راحت کے ساتھ بسر ہوئی۔

بیادری کی کثرت اور آبادی کے نئے ہونے کی وجہ سے، ابتدا میں انگریزوں نے قیدیوں کے لیے بڑے نرم قوانین رکھے تھے اور ان سے اچھا سلوک کرتے تھے لیکن جب آب و ہوا بھی ہو گئی اور آبادی بھی بڑھ گئی تو کالا پانی کے لیے ایسے ایسے سخت قانون بنائے گئے کہ لالمان الحفیظ۔ ہم جس زمانہ میں پہنچے آب و ہوا تو عمدہ ہو گئی تھی لیکن ابھی تک قانون میں سختی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے ہمیں پہنچتے ہی ان جزائر کے عام قوانین کے مطابق عمدے، تنخواہیں اور آرام و آسائش کی سہولتیں میسر آ گئی تھیں۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ قانون میں سختی کی جانے لگی حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نئے قیدیوں کو حکم تھا کہ دس برس تک سخت مشقت کریں، بھنڈارے سے کھانا کھائیں دڑی کا کپڑا پہنیں، بارک میں رہیں اور انہیں کسی قسم کی سہولت دینا نہ کی جائے؛ چنانچہ قانون انڈمان بُریۃ مشرق سے ایک فقرہ بطور مثال لکھتا ہوں :-

”سزا پس عبور دیا گئے شور کا مطلب یہ ہے کہ قیدیوں سے سخت سے سخت

مشقت لی جائے اور کھانے پینے کو صرف اس قدر دیا جائے کہ جسم و جان

کا رشتہ قائم رہ سکے“

مگر اس میں خیریت کا پہلو یہ تھا کہ ان قوانین کا اطلاق صرف نئے قیدیوں پر ہوتا تھا، ہم پر ان زندانیان سے مستثنیٰ قرار دے دیئے جاتے تھے۔

میں نے یہاں آکر دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی بدولت یہاں بیسیوں راجے، نواب، زمیندار، مولوی

مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالہ دار اور صوبے وار وغیرہ نسبت پوشی ادا کر رہے ہیں۔

نسلی امتیاز وہ معزز ہندوستانی جن کے آگے چلے گئے ہزاروں نوکر تھے انہیں

بھی سیاہ رنگت اور ہندوستانی باشندے ہونے کی وجہ سے دوسرے چوڑے چہروں کی طرح مٹا جھوٹا کھانا دیا جاتا اور عام لوگوں کے ساتھ ان سے بھی مشقت لی جاتی تھی۔ مگر یورپین گورے بلکہ اکثر دو گلے والے کھوٹے بھی فقط کوٹ پتھن کے شرف یا عیسائی کلمہ پڑھنے کی وجہ سے پٹن کے گوروں کے ہمراہ کھانے اور کپڑے کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ان کے رہنے کے لیے الگ بنگلے اور ندمت کے لیے ماتخا اور کرامور تھے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جس گورے یا دو گلے کو لائسنس مل جاتا، اس کو تو پچاس روپیہ ماہوار تک نقد تنخواہ بھی ملتی تھی۔

۱۸۷۹ء میں ایک نیا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا جسے دیکھ کر لوگوں کو رونانا آتا تھا اور وہ یہ کہ اس سال ایک بد بخت راجہ بگن ناٹھ پوری — جس کے لیے مدت تک اخباروں نے بھی ہر عجیب و غریب — قید ہو کر کالا پانی پہنچا۔ چہرے کی رنگت کے سیاہ ہونے کے باعث وہ بے چارہ عام چوڑے چہروں کے ساتھ کھانا کھاتا اور مشقت کرتا تھا۔ جب نازک مزاجی کے سبب مشقت نہ کر سکتا تھا تو جیل، ہیٹ اور چکی پیسنے کی سزا پاتا، آخر کار ان صدیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جیل میں چل بسا۔

انہی دنوں مسٹر ٹیمپلر نامی ایک کرانی بھی یہیں پہنچا جو کرا دو سے قید ہو کر آیا تھا۔ وہ بھی اگرچہ رنگ کا کالا تھا، لیکن کوٹ پٹھن پہننے اور یورپ کا باشندہ ہونے کے باعث گوروں کے ساتھ عمدہ کھانا کھاتا تھا۔ رہنے کے لیے اسے ایک الگ مکان مل گیا، جس میں میٹھ و آرام کا سب سامان تھا۔ مشقت کے بجائے اس پر یہ انعام کیا گیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر کی کچری میں کلرک لگا دیا گیا۔ چونکہ یہ بخت راجہ اور یہ خوش نصیب کرانی یہاں بیک وقت پہنچے تھے، اس لیے اس اختلاف سلوک اور ظرداری کو دیکھ کر ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

ہمارے اندامان پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد کا واقعہ ہے کہ سرواک کے راجہ برکس نے اپنی مدد کے لیے کچھ قیدیوں کو طلب کیا، پیناچہ حکومت ہند

ملازمت

کے جنگ آزادی کے پچاس قیدیوں کو جن میں سے اکثر ہندی اور بعد از انگریز تھے۔

بروکس کے پاس بھیج دیئے۔ ان قیدیوں کے جانے کی وجہ سے کئی عہدہ عہدہ خالی ہو گئے تھے۔ اخبارات کے ذریعہ اور مولانا احمد اللہ سے ان لوگوں کو میری قابلیت کا علم ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ کے فضل سے جہاز سے اترتے ہی مجھے سپرنٹنڈنٹ اور چیف کمنڈر کی کچہری میں محرر سیکشن دار یا نائب میگزینی مقرر کر دیا گیا۔ رہنے کے لیے ایک مکان اور خدمت کے لیے ایک تنخواہ دار نوکر بھی مل گیا۔ آزاد بندوں کی طرح جہاں چاہتا رہتا اور جہاں چاہتا جاتا، مطلق روک ٹوک نہ تھی۔

جب میں یہاں پہنچا تو میرا عالم شباب تھا، عمر کی ستائیسویں منزل میں تھا۔ عمر کے اس حصہ میں مجرد بہنادینی و دنیوی

شادی خانہ آبادی

قباحتوں سے خالی نہ تھا۔ اس لیے پہلے تو میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے ملک سے اپنی عورت کو بلاؤں لیکن قانون اس سلسلہ میں مانع تھا۔ پھر میں نے چند ماہ بعد ایک نو آمدہ کشمیری عورت سے شادی کر لی، جو کہ نہایت کم سن تھی اور کسی بلائے ناگہانی میں گرفتار ہو کر یہاں آئی تھی۔ میرے جلالہ عقد میں آنے کے بعد بڑی دیندار اور خدمت گزار بن گئی۔

میں نے یہاں آ کر محسوس کیا کہ ہر وہ چیز جو ہندوستان میں مجھ سے چھوٹی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا نعم البدل عطا فرمانا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے میری دشمنی پر کمر باندھ رکھی تھی، وہ اب ایک ایک کر کے تباہ و برباد ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب میں ہندوستان آیا تو ہر شخص حسب مدارج اپنی اپنی سزا حاصل کر چکا تھا۔

زمانہ قید میں ۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو میں جزیرہ پرسپور بیٹ میں تھا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب بھی انڈمان پہنچ گئے

مولانا عبد الرحیم

پہلے تو آپ کے گھاٹ بنی مقرر کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد آپ کو ہسپتال میں محرر مقرر کر دیا گیا۔ نو برس تک سرکاری کام کرنے کے بعد انہوں نے بزاز کی دکان کھولنے کا سوچ لیا، جب رانی ہوئی تو اس وقت بھی اسی پیشہ و کانداری سے منسلک تھے۔

تین مہلک حادثے | سمندر کے کنارے آباد ملکوں، جہاز کے ملازموں اور

سیاحوں کو اکثر بحری آفات میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے، جن سے ہندوستان کے آدمی سراسر نادان ہیں۔ کالے پانی میں بھی ہر سال بہت سے آدمی اور کشتیاں سمندر کی نذر ہو جایا کرتی ہیں۔ اس میں سال کی مدت میں مجھے بھی، بارہا ان آفات کا سامنا کرنا پڑا، مگر عین ڈوبنے کے وقت سب چاروں طرف سے ناامید ہو کر اللہ رب العزت کی طرف رجوع کرتا، تو وہ رب تہرے مجھے فوراً بچا لیتا تھا۔ ان بہت سی آفتوں میں سے جن میں یہ خاکسار وقتاً فوقتاً مبتلا ہو کر بچتا رہا، صرف تین واقعات کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں روس سے جزیرہ پرسپنس پینٹ کی طرف جا رہا تھا کہ پرسپنس پینٹ کے نزدیک پہنچ کر ایسا طوفان باد و باراں شروع ہوا کہ کشتی ڈنگا گئے لی اور ڈوبنے کے بالکل قریب تھی کہ موج کے ایک تھپڑ سے نے اسے پل سنگ کے نزدیک کر دیا۔ اس وقت میں اور ایک دو دوسرے مسافر مسعدی سے پل پر کود پڑے۔ ابھی ہمارے پاؤں پل پر لگے ہی تھے کہ ایک موج کے کشتی کو اس زور سے مے مارا کہ کشتی ریزہ ریزہ ہو گئی اور مسافر سخت زخمی ہو گئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ابرڈین سے روس جاتے وقت بھی بالکل اسی طرح کے حادثہ سے دو چار ہونا پڑا۔ اس حادثہ میں بھی موہیں کشتی کو پل پر دے مارنا چاہتی تھیں کہ ہم کو دریل پر جا کھڑے ہونے۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پل سے ٹکرائی اور اس کے بڑے اڑ گئے، اکثر مسافر مجروح ہوئے اور بڑی مشکل سے ڈوبنے سے بچ گئے۔

ایک تیسری مرتبہ ہماری کچہری کا سارا عملہ کشتی میں سوار ہو کر ابرڈین کو جا رہا تھا کہ عین وہاں ایک سخت طوفان آیا کہ سب لوگ ناامید ہو گئے اور موت و حیات کی کش مکش میں بندھا سمجھنے لگے۔ بارش اور ہوا بھی بڑے زور سے تھی۔ نزدیک کوئی کنارہ تھا نہ فریادرس اندیشہ ایسا شدید تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اچانک کشتی کا مکان بھی ٹوٹ گیا اور کشتی پانی سے بھر گئی الغرض کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہا اور سب راستے مسدود ہو گئے تو میں سوچا کہ میں نہ اس فریادرس سے داد رسی کی جائے جو سب در ماندہ لوگوں کے ٹوٹے ہوئے

دلوں کا سہارا ہے۔ میں نے اپنے خدا سے لولگائی، میں نے اپنے آقا کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دی، میں نے اپنے مولا کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیا۔ ابھی دعا ختم نہ کی تھی کہ اچانک ہمارے پاس ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی، جس میں سردارِ گھمیل سنگھ پرنٹینڈنٹ پولیس سوار تھے۔ انہوں نے ہمیں اس تباہ حال صورت میں دیکھ کر جھٹ پٹ اپنی کشتی میں لے لیا اور اللہ کے فضل سے کشتی صحیح سلامت کنارے تک پہنچ گئی۔ اس واقعہ سے ”اَمَّنْ يُّجِيبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَا“ کی ایسی تفسیر سمجھ میں آئی، جو آج تک کوئی واعظ، کوئی خطیب اور کوئی مفسر نہ سمجھا سکا۔

جنوری ۱۸۶۸ء میں خاکسار کا جزیرہ ہدو میں تبادلوں کا ہو گیا اور وہاں اسٹیشن محرر مقرر ہو گیا۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۸ء کو روس میں مولانا کی اعلیٰ صاحب راہی فردوس ہو گئے۔ میں ان سے بہت فاصلہ پر جزیرہ ہدو میں مقیم تھا، مجھے ان کی بیماری کی اطلاع بھی نہیں تھی مگر تقدیر عین اس وقت مجھے روس لے گئی جب ان کا بخارہ بالکل تیار تھا اور نماز پڑھنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ ہمارے مقدمے کے کئی آدمی ان کی تجویز و کمین میں شریک ہو گئے تھے۔ میری بیوی مولانا کی اعلیٰ صاحب سے مرید تھی اور ان سے بہت محبت رکھتی تھی۔ اسے ان کی وفات سے بہت زیادہ صدمہ پہنچا؛ چنانچہ مولانا مرحوم کی وفات کے سوا دو مہینے بعد وہ نیک بخت بھی ۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء کو راہی فردوس ہو گئی۔ میرا ہندوستان سے قید ہو کر جانا گویا اس بی بی کے خاتمہِ بخیر کی تہنید تھا۔

اس بیوی کی وفات کے بعد میں نے سب زیور و غیرہ فروخت کر کے تین سو روپے دہلی میں اپنی بیوی کے پاس بھیج دیئے تاکہ وہ جوتے اور دیگر سامان خرید کر میرے پاس بھیج دے کیونکہ ان دنوں پورٹ بلیر میں دہلی کا مال تنگے چو گئے دام پر فروخت ہوتا تھا۔ مگر یہ مال زیادہ تر راستہ میں ضائع ہو گیا۔ دہلی سے روانہ ہونے کی تاریخ سے دو برس بعد گل برٹ کر تھوڑا سا مال ۱۸۷۰ء کو میرے پاس

تجارت

پہنچا، جس سے مجھے صرف ایک سو پچاس روپے وصول ہوئے اور ایک سو پچاس روپے کا خسارہ ہوا۔

اس ایک صد روپے کا سود پچاس روپیہ کو بھیج دیا۔ مگر اس نے کلکتہ سے مال منگوانے کے لیے ایک دوست کے پاس بھیج دیا، تو بنگالی باپوں نے مخبری کر کے وہ ہنڈی پکڑوا دی کیونکہ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مال ایک سوداگر کے نام سے منگوا لیا تھا اور ہنڈی ایک ایکسٹرنل اسٹیشن کشن کی طرف سے تھی۔ طلب مال کے لیے خط میری طرف سے لکھا ہوا تھا۔ خط بعد ہنڈی پکڑا لیا اور چیف کمشنر کے پاس پیش ہوا اور یہ میری سزا کے لیے کافی تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اور ہنڈی دونوں کو بچا لیا۔ وہ سوداگر جس کے پاس ہنڈی بھیجی گئی تھی، رقم وصول کر کے کلکتہ سے فرار ہو گیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ میں تجارت کروں۔ لہذا اس کے بعد کبھی تجارت کا ارادہ نہ کیا۔

اس بیوی کی وفات کے بعد دو برس تک مجھ پر رہا۔ جریرہ بیوی کا انتقال

تھا۔ بہت سی عورتوں نے مجھے شکار بھی کرنا چاہا مگر حفاظت غیبی شامل رہی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ہلاک نہ ہونے دیا۔ گواپنے عہدہ کی وجہ سے رات دن مجھے ان فاحشوں سے ملنا پڑتا تھا اور طرح طرح کے سرکاری کام لینے پڑتے تھے کہ وہ اکثر میرے گھر بھی آتی جاتی تھیں اور مجھے شکار کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھتے ؟

میں نے یہ کیفیت دیکھی تو اپنی بیوی کو پانی پت سے پھر بلانا چاہا لیکن وہ راضی نہ ہوئی اور جب اس نے اپنی رضا کا اظہار کیا تو حاکم وقت نے میری درخواست نامنظور کر دی۔ اس لیے میں نے مجبوراً کسی نیک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا اور بارگاہ الہی میں التجا کی کہ اے اللہ جیسے تجھے پسند ہو، پردہ غیب سے اس کا انتظام فرما دے اور کسی نیک بخت سے میرا جوڑگ کرادے۔ ابتدا میں تو بعض دوستوں کے مشورے سے بچے بعد دیگرے دو پنجابی مسلمان

عورتوں سے میرے نکاح کی بات چیت شروع ہوئی مگر طرفین کی رضامندی اور کسی ظاہری نکتہ کے نہ ہونے کے باوجود بات خود بخود موقوف ہو گئی۔ اس وقت تو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ میل کیوں نہ منڈھے چڑھ سکی، لیکن بعد میں جب دوسرے دو آدمیوں سے ان کی شادی ہوئی، تو معلوم ہوا کہ وہ صحیح کردار کی مالک نہ تھیں۔ میں اس حفاظت غیبی پر شکر الہی بجالایا۔

دوسری شادی

ضلع المورہ کی برہمن قوم سے تعلق رکھنے والی ایک ہندو عورت ان دنوں نئی نئی قید ہو کر کالا پانی آئی اور بدوین عورتوں کی بارک میں اسے رکھا گیا۔ وہ نہایت خوش چلن اور حیا دار عورت تھی مگر ہندو دھرم میں نہایت متعصب کسی مسلمان عورت کے نزدیک کھڑا ہونا یا اس کے پکڑوں کو بھونچنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ بارک کی مسلمان عورتیں تو اس کے تعصب کی وجہ سے تنگ آ گئی تھیں۔

میں نے ایک دن بریل میں تذکرہ اس سے کیا کہ اگر تو مسلمان ہو جائے تو دنیا و آخرت دونوں میں تیرے لیے یہ بہتر ہو گا اور دوزخ کی آگ سے بھی تجھے نجات مل جائے گی۔ میری بات سن کر اس نے نہایت حیرت کا اظہار کیا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ روزِ اوّل سے میرے پوتوں کی والدہ ہونا، اس کے مقدر ہو چکا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باوجودیکہ وہ کوہستان کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئی، جہاں اب بھی مسلمانوں کا نام و نشان نہیں لیکن وہ ہمیشہ شرک اور بت پرستی سے بیزار رہی، گوا سے بھی اس بیزاری کا سبب معلوم نہ تھا۔ اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ایک جوتشی برہمن نے اس کی والدہ کو یہ کہہ دیا تھا کہ یہ لڑکی تم سے جلدی جدا ہو جائے گی۔

اپریل ۱۸۶۸ء میں جب میری کشمیری بیوی فوت ہوئی، انہی ایام کا تذکرہ ہے کہ اس برہمن عورت پر ایک ناگانی مقدمہ ہو گیا، جس کے باعث یہ گرفتار ہو گئی۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایک لڑکی میری اس بیوی کے ساتھ ایک بیل باؤ گمنام کے قریب کھیل رہی تھی، اتفاق سے اس لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ گمنام میں گر کر

سخت مجروح ہو گئی۔ اگرچہ اس میں میری بیوی کا قطعاً کوئی قصور نہیں تھا لیکن ان دونوں لڑکیوں کے والدین کے درمیان سخت عداوت تھی۔ لہذا انہوں نے اسی دیرینہ عداوت کی بنا پر اس بے گناہ پر اقدام قتل کا کیس کر دیا۔ قانونی طور پر یہ مقدمہ اگرچہ اس لائق تونہ تھا کہ اسے جس دوام کی مراد دی جائے، مگر اس حکیم و قدیر کو اسے میری بیوی بنانا منظور تھا، لہذا اسے اس جرم کی پاداش میں پورٹ بلیر پہنچا دیا۔

گرفتاری کی پہلی شب ہی تھی کہ اس نے بوقتِ سحر خواب میں ایک نورانی چہرہ بزرگ مسلمان کو دیکھا، جس نے اسے ٹھوکر مار کر کہا اٹھو! نماز پڑھو اور دعا کرو، تمہارے لیے قید ہونا بہتر ہے۔ اس نے اسی صورت کا کبھی کوئی انسان دیکھا تھا اور نہ نماز و دعا کے الفاظ سے آشنا تھی۔ گھبرا کر بیدار ہو گئی۔ محافل میں سے ایک مسلمان سپاہی سے خواب بیان کر کے تعبیر پوچھی تو اس نے کہا کہ تو اس قید میں منور مسلمان ہو جائے گی۔

اس وقت یہ تعبیر اس کی طبع نازک پر بنائیت گراں گزری اور اسے بالکل غیر ممکن معلوم ہوئی مگر قبولیت ازلی اور تعبیرِ رؤیا سے حق کی بنا پر اس نے میری پیشکش کو قبول کر لیا اور مسلمان ہو کر میرے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

اتفاق سے انہی دنوں رمضان المبارک جلوہ فگن ہو گیا۔ رمضان کی ۲۷ تاریخ کو میں نے بڑے دھوم دھام سے ایک تقریب کا اہتمام کیا اور اسے مسلمان بنالیا۔ جب اس نے ارکانِ اسلام اور نماز وغیرہ کے مسائل کو بخوبی سیکھ لیا تو میں نے حاکم وقت کو مطلع کر کے ۱۵ اپریل شملہ عک کو اس سے شادی کر لی۔ صد ہا آدمیوں نے اس تقریب سعید میں شرکت کی اور خوبی قسمت کی بات یہ کہ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب نے خلیفہ نکاح پڑھا تھا۔ دوسرے دن بڑی شان و شوکت سے دعوتِ ولیمہ کا انتظام کیا گیا، جس میں بہت سے اجنبی نے شرکت فرمائی۔

اس بیوی کے بطن اطہر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دس بچے عطا فرمائے، جن میں

سے آٹھ بچے اس وقت تک بعید حیات ہیں۔ یہ بیوی پورٹ بلیر سے میرے ساتھ ہنٹ بھی واپس آئی۔ اس نے گزشتہ بائیس برس نہایت حسنِ رفاقت، اطاعت اور عصمت کے ساتھ بسر کیے ہیں اور توحید و توکل میں بھی یہ بیوی لاثانی ہے۔

چند خطوط پورٹ بلیر پہنچ کر میں نے حاجی محمد شفیع صاحب انبالوی کو وقتاً فوقتاً چند خطوط بھی لکھے، جن میں آرام و آسائش کے ساتھ زندگی بسر کرنے، شادی اور ملازمت کا ذکر کیا تھا۔ کچھ خطوط ان لوگوں کو بھی بھیجے جو بے قصور مسلمانوں کو چنسا کر نیم رہائی کی شکل میں دولت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں حسرت میں مبتلا کرنے کے لیے میں اپنی راحت اور تائید الہی کا مبالغہ آمیز الفاظ میں ذکر کیا لیکن ان میں سے کسی خط کا بھی جواب نہ آیا۔

اسی اثناء میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے سرکار کی خیر خواہی کے لیے، وہ خطوط گورنمنٹ ہند کو پہنچا دیئے اور ان پر خوب بحث ہوئی حتیٰ کہ سپرنٹنڈنٹ پورٹ بلیر سے بھی صحیح کیفیت کے متعلق استفسار کیا گیا۔ اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا، حکام پورٹ بلیر میرے لیے بطور وکیل نہ بھگڑتے اور مراعات کا سلب کر لینا پورٹ بلیر کے قاعدہ عام کے خلاف نہ ہوتا تو میرے لیے سخت مشقت کا حکم ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ یہ اللہ کا خاص فضل ہی تو تھا، یہ اس کی طرف سے تائیدِ غیبی ہی تو تھی کہ جان لانس بہادر گورنر جنرل مجھ جیسے غریب قیدی سے سخت مشقت لینے کا مستحق ہو اور مجھے سزا بھی سخت مشقت و تاحیات کی مل چکی ہو لیکن اللہ تعالیٰ ایسے سخت بگھیلوں کے باوجود مجھے سخت مشقت سے بچالے۔

اللہ کی طرف سے ایک فضل یہ بھی تھا کہ جب ہم پورٹ بلیر پہنچے تو اس وقت یہاں کے سب محکمہ دار اس کے تھے، وہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ اور دہلیوں کی بغاوت سے واقف نہ تھے، اس لیے ان کے دل صاف اور سینے خالی از تعصب تھے۔ انہوں نے مجھے ساتھ نہایت حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا بلکہ ہماری خوش چلنی، خوش اخلاقی اور عمدہ

کارگزاری کے باعث ۱۸۵۷ء کے دیگر قیدیوں کی نسبت زیادہ مراعات سے نوازا۔
جب پہلی مرتبہ ڈاکٹر ہنٹر نے مریجنگ لگا کر ہمارے مقدمہ کو دسی سے سانپ
اور رائی سے ہمارا بنا کر پیش کیا اور لکھ دیا کہ وہابی اور باغی کے ایک ہی معنی ہیں اور جنگال کو
کے صاحب لوگ اس جزیرہ میں آنے گئے، تو ہم آلام و مصائب کا تختہ مشق بن گئے،
راہ چلتے ہماری طرف اشارے کیے جاتے اور وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ انہیں
کب کوئی موقع ملے کہ قانونی حیلہ کی آڑ میں ایذا رسانی کے درپے ہو جائیں لیکن جب خدا
تعالیٰ جیسے محافظ حقیقی کی حفاظت نصیب ہو تو کون ہے جو تکلیف پہنچا سکے؟ میں نے بار بار
خدا کی نصرت کا مشاہدہ کیا کہ جب کوئی درپے تکلیف ہو تو فی الواقع تعینتی نے مدد اور اعانت
کا ایسا سامان کر دیا کہ دشمن منہ تھکے رہ گئے۔

ایک جھوٹا مقدمہ

سینٹنٹ کر نل مین کے عہد میں ایک بڑے یورپین افسر
کی تحریک سے میرے خلاف اعانت تعرت بے جا کا جھوٹا
مقدمہ کر دیا گیا، جس کی وجہ سے کر نل مین جیسا بے تعصب حاکم بھی مجھ سے برا فروخت ہو گیا اور اس
نے مجھے بذریعہ من فور عدالت میں طلب کر لیا۔ اس وقت بہت سے دوستوں نے مشورہ
دیا کہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے لہذا تم لا علمی کا اظہار کر کے اپنی جان بچالو۔
میں نے دوستوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا: ”کچھ بھی ہو میں تو سچ بولوں گا۔“

جب مقدمہ پیش ہوا تو سب سے پہلے مجھے طلب کیا گیا اور کر نل صاحب نے میرے
بیانات قلمبند کرنا شروع کر دیئے۔ میں نے صحیح طور پر حرت بحرف بیان کر دیا کہ میرے سامنے
مسٹر ہیوڈ اور سیرید غلیہ نے ستمی حمید خاں جمہار مدعی کی جائیداد جہاں جہاں پائی، بطور غوث
ضبط کر کے نیکلام اور فروخت کر دی اور اس کا زرخیز غوث کھا گیا۔ میں محروم سٹیشن ہونے کی
وجہ سے اس کے ہمراہ مزدور تھا..... میرا بیاں اس قدر ہوا ہی تھا کہ مسٹر ہیوڈ سے
تمام رقم حمید خاں مدعی کو واپس لائی گئی اور ہیوڈ کو جو کچھ سو روپیہ ماہوار کا اور سیرید غلیہ کی ملازمت سے

برطرف کیے ان جرائد سے بدر کر دیا گیا۔ میں اپنے سچ کی برکت سے صاف بری ہو کر گھر چلا آیا
 انہی ایام یعنی جنوری ۱۹۶۹ء میں یونیٹ پر اتھرو۔ جو اس وقت کرنل اور فٹ ام
 مقام چیف کمشنر پورٹ بلیر ہیں۔ کالے پانی میں اسٹنٹ ہو کر آئے تھے۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں جب عید الاضحیٰ آئی تو ہم نے ایک
 عید الاضحیٰ کے موقعہ پر جھگڑا

مگر قربانی کے وقت بادہ کر کے ہندوؤں نے ہم سے بیل چھین لینا چاہا مگر ہمارے ساتھیوں نے
 ان کے حملہ کو غیر واجبی قرار دیتے ہوئے بیل دینے سے انکار کر دیا۔ ہندو حسب عادت بڑے
 جوش و خروش میں تھے۔ ہم نے عین اس وقت بیل کو قربان کر دیا، بس ہندو بیل کی قربانی
 کے ساتھ ہماری قربانی کرنے کے لیے ہمارے سروں پر سٹیج ہو کر ٹھٹھے تھے۔ ہم مسلمان صرف
 چار پانچ تھے جب کہ ہندو دوسو سے بھی زیادہ تھے۔ اتنی قلیل جماعت کے لیے یہی قرینہ صحت
 تھا کہ وہ اتنی کثیر اور پُر جوش جماعت کا مقابلہ نہ کریں مگر مذہبی جوش اور ادائے فرض
 نے ہمیں بھی مجبور کر دیا تھا۔ جب ہندوؤں کے سامنے بیل فوج ہوا اور اس کی گردن سے خون
 کے فوارے بہہ نکلے تو انہوں نے بڑا بلوہ کیا اور شور و غلب کے ساتھ آسمان کو سر پر اٹھالیا۔
 ممکن تھا کہ دس بیس لاکھ خاک و خون میں تڑپ جلتے مگر پولیس اور اودو میر کے جلد پہنچ جانے کے
 باعث کشت و خون کی فوج نہ پہنچی۔

ہندوؤں کی سازشیں

مقدمہ پچھری میں چلنے لگا۔ ہندو بڑے مالدار، صاحب
 اقتدار اور حکام کے منہ پر ٹھے ہوئے تھے لیکن پراٹھو
 صاحب کی کوشش اور امداد سے ہم لوگ پہنچ گئے۔ میرے خیالات اور سمجھ بوجھ کی کیفیت جو
 اب ہے اگر اس وقت بھی یہی ہوتی تو میں بیل کے بجائے بڑے کی قربانی کو ترجیح دیتا اور صد
 آدمیوں کے دلوں کو نہ دکھاتا۔

جہاں سن در پے آزار و ہر چ خواہی کن کہ در شریعت ماغیر ازیں گنا ہے نیست

قربانی کے اس واقعہ کے بعد پورٹ بلیر کے سب ہندو آپس میں متفق ہو گئے کہ خواہ ہزاروں روپیہ خرچ ہو جائے ہم محمد جعفر کو سخت سزا دلا کر چھوڑیں گے۔ انہوں نے سنا باز کر کے مونگالال محرو کو جو میرے ماتحت تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسٹیشن کے حساب میں تغیر و تبدل کر کے میرے خلافت چوری اور غبن کا دعویٰ دائر کر دے؛ چنانچہ اس نے نیلام کے ایک حساب میں جو میری معرفت ہوا تھا، کمی بیشی کر کے سو روپیہ کا غبن میرے ذمہ لگا دیا۔ فارسی اور انگریزی دونوں حسابوں سے ان رقوم کی تصدیق کر کے بہت سے گواہ بھی بنائے۔ اگرچہ ضلع دار کو اس کی خفیہ رپورٹ ہو گئی تھی مگر ابھی تک مجھے اس کا ردوائی کا قطعاً علم نہ تھا۔ آخر کار ایک دن اور میر نے میرے گھر اچانک چھاپہ مارا اور سرکاری حساب کتاب سے متعلق تمام کتابیں اپنی گرفت میں لے لیں۔ میں نے سمجھا شاید میرے قتل کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ جب مجھے صحیح صورت حال کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ دوسرے دن اس کیس کی تحقیق بھی ہو رہی ہے تو میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی زیر حراست کتابوں کو ایک گھنٹہ کے لیے حاصل کر کے اور اس ایک گھنٹہ میں جلسہ رزی کی اس کارروائی کو میا میٹ کر کے جو ایک مہینہ میں تیار ہوئی تھی، اپنا حساب ٹھیک کر دیا۔

دوسرے دن جرنل انڈمان کے اسٹنٹ سیزنٹنٹ پر اتھر و صاحب کے زیر صدارت اجلاس میں تحقیقات شروع ہوئی۔ جب مدعیوں کی نشاندہی کے مطابق کتابوں میں حساب دیکھا گیا تو وہ بالکل درست نکلا اور اس میں سر موقوف نہ تھا۔ پر اتھر و صاحب چونکہ چند روز پہلے قربانی کے مقدمہ میں نہیں بری کر چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ مقدمہ اس قربانی والے مقدمہ کے باعث محض عداوت اور دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ اس نے مونگالال کو پچھ ماہ کی سخت قید اور ایک ہندو ریٹر کو ایک درجن کوڑوں کی سزا دی اور مجھے بری کر دیا۔ ہندو غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے انہوں نے کورٹ میں کھڑے کھڑے میرے ایک دوسرا الزام چوری کا بھی لگا دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مونگالال نے سزا پانے کے بعد

ہاتھ باندھ کر پراخرو صاحب سے عرض کیا: ”حضور کچھ میری عرض ہے“ صاحب نے کہا: کو! کیا ہے؟ اس نے کہا کہ حضور نے محمد جعفر کو بازار بنوانے کے لیے لکڑی کے جو سرخ تختے دیئے تھے، اس نسا نہیں اپنے گھر میں استعمال کر لیا ہے اور ان سے گھر کے دروازے، تخت پوش اور صندوق بنوائے ہیں اگر حضور اسی وقت تکلیف گوارا فرمائیں تو میں وہ سب چیزیں محمد جعفر کے گھر سے کپڑاوا سکتا ہوں۔

مونا صاحب یہ بیان دے رہا تھا تو میں سر جھکائے خداوند تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ اس آفت سے بچانا بھی تیرا ہی کام ہے۔ وہ سب چیزیں میرے گھر میں موجود تھیں اور اگر حاکم منجھ سے پوچھتا تو اثبات میں سر ہلانے کے سوا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مگر اس مقلب الطرب کی قدرتِ کاملہ کی کرشمہ سازی بغور سننے کے قابل ہے کہ مونا کا کہنا کہ جواب میں پراخرو نے کہا کہ وہ تختہ تو ہم نے اسے دیا ہے۔ تین خبری کرنے کا کیا حق ہے۔ نکل جاؤ کم بخت میری عدالت سے اور مجھ سے فرمایا کہ تم گھر جاؤ اور آئندہ کے لیے ہوشیار رہو!

۱۸۶۹ء کا ذکر ہے کہ میرے گھر میں بدو اسٹیشن کے قیدیوں کی خواہ کا مبلغ پانچ سو روپیہ موجود تھا۔ ایک رات گھر کی کھڑکی توڑ کر ایک چور اندر گھس آیا، میرے پیٹنگ کے نیچے چلتی ہوئی تکی کو اس نے گل کر دیا، رقم ایک چھوٹے سے صندوق میں تھی جو کہ میری پابنتی کے پاس رکھا ہوا تھا۔ میں گری نیند سو رہا تھا۔ میرا فوک مراد بھی ایک دوسری کوٹھڑی میں رہا تھا الغرض چور کے راستہ میں کوئی چیز بھی مانع نہ تھی۔ وہ مال میٹ کر جانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی، میں نے اندھیرا دیکھ کر اور کچھ آہٹ پا کر اپنے غلام مراد کو آواز میں دینا شروع کر دیا۔ چور خالی ہاتھ اور نامراد ہو کر فوراً بھاگ گیا اور اللہ رب العزت نے میری عزت رکھ لی اگر سرکاری روپیہ چوری ہو جاتا تو اس میں بظاہر سخت خرابی اور بے جا دی تھی۔

مارچ ۱۸۷۱ء میں میں نے ایک صد پچاس روپے کی ایک ہندی مسٹر اسٹراپ اکثر

ہسٹنٹ فشر کی طرف سے نشی غلام نبی کے نام لکھتے بھیجی تھی، جس کے ذریعے میں اپنی شادی کے لیے بعض ضروری سامان منگوانا چاہتا تھا اور مال بھی ایک دوسرے تاجر کے نام سے منگوانا تجویز کیا تھا کیونکہ میں سرکاری ملازم تھا۔ مجھے ہنڈی بھیجے کا اختیار تھا نہ مال منگوانے کا۔ یہ سب ناجائز کارروائی تھی اور پرہیزگاری جاری تھی۔

جب میں نے خط مع ہنڈی ڈاک میں ڈالا تو میرے دشمن، ہندوؤں کو بھی کسی ذلیلہ سے اس کی خبر ہو گئی۔ انہوں نے کونسل میں چیف فشر کو خبر دی کہ اس خط اور ہنڈی کو پکڑوا دیا اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ہنڈی کی تبدیلی کے علاوہ مجھے سزا بھی دلائی جائے۔ مجھے جب خط اور ہنڈی کے پکڑے جانے کا علم ہوا تو میں نے فوراً اپنے خدا کے دروازے پر دستک دی اور عرض کیا کہ اے اللہ! اس مشکل سے نجات بھی توبہ دے سکتا ہے۔ دعا کے بعد پراخرو صاحب کے پاس جا کر میں نے سارا حال کہنایا اور کہا کہ یہ بھی وحشیانہ اسی قربانی والے عقد کی ور سے عداوت کا نتیجہ ہے۔ پراخرو نے کہا: فکر نہ کرو میں کونسل میں سے ملاقات کر کے صورت حال دریافت کروں گا۔ انگریز پراخرو صاحب کونسل میں کی تو فوجی پر گئے اور ان سے ملاقات کر کے میری ہنڈی اور خط دونوں واپس لے آئے اور مجھے دے دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جلد واپس آؤ گے دشمن ہیں۔ تم ہوشیار اور چمکتا رہا کرو۔

مولانا محمد حسن، اندمان میں
 ایک دست سب سے میرا عزیز ہوا وہ روسی آباد
 ہو گیا۔ میری ملاقات کو سب میں جزیہ روسی تھا۔
 محمد حسن صاحب ہماری ملاقات کے لیے پشور سے پورے آئے اور ایک مہینہ دیکر واپس
 وطن آکر رہنے لگے۔

ایک دن سب مولانا پشور سے فوجی شوق سے کشتی میں سوار ہو کر مولانا احمد صاحب کی ملاقات کے لیے پشور سے واپس جا رہے تھے تو راستہ میں کشتی طوفانِ بد و باران میں بھنس گئی، قریب تھا کہ کراہا میں ڈوٹا گاتے ہوئے ڈوب جائے۔ مولانا کو کشتی کے ڈوبنے

کی بجائے زیادہ افسوس یہ تھا کہ مولانا احمد اللہ صاحب کی زیارت نصیب نہ ہو سکے گی لیکن یہ فقط آزمائش تھی۔ چند بھونکوں کے بعد طوفان ختم گیا اور مولانا بخیریت و سر پہنچ گئے اور مولانا احمد اللہ صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔

ہماری گرفتاری کے بعد انگریزوں نے مولانا محمد حسن کو بھی پھنسا کر کالے پانی بھیجنا چاہا تھا مگر اللہ کے فضل سے وہ محفوظ رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح بھی کالے پانی بھیج کر اور مصائبِ بحری میں مبتلا کر کے اسیرانِ کالا پانی کے اجر و ثواب میں شریک کر دیا۔

مارچ ۱۸۷۸ء میں چیف کمشنر کرنل مین ریٹائرڈ ہو گئے اور وہ نیشنل پارک ولایت پٹلے گئے۔ اکتوبر ۱۸۷۸ء میں جنرل اسٹوارٹ — جو آخریں ہندوستان کے جنگی لاٹ بھی ہو گئے تھے — چیف کمشنر بن کر انڈمان آئے۔ اسی کے عہد میں لارڈ میو صاحب بہادر کے حکم سے پورٹ بلیر کے قیدیوں کے لیے بھنڈار کا کھانا مقرر ہوا اور لارڈ میو کا بنایا ہوا وہ قانون بھی جاری ہوا، جس کے باعث پورٹ بلیر کی قید ہندوستان اور ولایت کے جیل خانوں سے بھی زیادہ سخت ہو گئی۔

اسی سپرنٹنڈنٹ کے عہد میں ۸ فروری ۱۸۷۸ء کو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ میو قتل کیے گئے۔ اس کی مختصر سی

لارڈ میو انڈمان میں

تفصیل یہ کہ ۸ فروری ۱۸۷۸ء کو لارڈ میو سات بجے کے بعد چار گنپٹوں میں جزیرہ انڈمان آئے۔ لارڈ صاحب کے ساتھ صدایورپین مرد عورتیں تھیں، جو ان جزائر کی سیر و سیاحت کے لیے آئی تھیں۔ ۸ بجے کے بعد گورنر صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پورٹ بلیر کے صدر مقام جزیرہ روس کی طرف چل پڑے۔ جب روس پہنچے تو انہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ جب سلامی جاتی جا رہی تھی تو جزیرہ کے گھاٹ پر ہزاروں مرد عورتیں، آزاد اور قیدی اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ لارڈ صاحب ٹاپو سے اترنے کے فوراً بعد روس کے بازار آئی لینڈ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور بازار، سکول، ہسپتال، قیدیوں کی بارکیں اور جنگی پلٹن کی بارکیں دیکھنے کے بعد انڈمان کے

چیف کشر کے بنگلہ پر چلے گئے۔ وہاں کھانے پینے اور تھوڑا سا آرام کرنے کے بعد گور بارک دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ پھر اپنے الگنوٹ کو دیکھتے ہوئے دیس پر چلے گئے، جہاں بد معاش قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، دیس کے ملاحظہ کے بعد جزیرہ چاٹم میں چلے گئے۔

جزیرہ چاٹم، روس اور دیس کے درمیان مونٹ ہریٹ کے قریب واقع ہے۔ یہاں ایک دغانی آرہ گھر بھی ہے۔ لارڈ صاحب نے یہاں سُرُخ لکڑی کے ایک تختہ کو بہت پسند کیا۔ چاٹم کی سیر کرتے کرتے لارڈ صاحب کے دل میں آیا کہ مونٹ ہریٹ کو بھی ملاحظہ کرنا چاہیے۔ وقت نامناسب ہونے کی وجہ سے پرائیویٹ سیکرٹری اور چیف کشر نے بڑے اصرار سے کہا کہ آج مونٹ ہریٹ نہیں جانا چاہیے لیکن لارڈ صاحب نہ مانے بلکہ صحیح الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ موت نے انہیں نہ مانے دیا۔

لارڈ میو کا قتل

چاٹم سے سوار ہو کر جب ہوپ ٹون پہنچے، جو کہ ہریٹ کے زیریں علاقے میں آباد ہے، تو وہاں شیر علی ایک آفریدی قیدی پھری لیے ہوئے تھے

دراز سے اس انتظار میں کھڑا تھا کہ کب یہاں سے کسی افسر کا گزر ہو اور وہ اسے پھری کا نشانہ بنا کر آتش انتقام کو سرد کرے۔ جب لارڈ صاحب کی کشتی ہوپ ٹون پہنچی تو وہ بھی اپنی پھری چھپانے ہوئے ان کے ہمراہ ہو گیا۔ راستہ میں اس کا کوئی داؤ نہ چلا اور لارڈ صاحب خیریت کے ساتھ پہاڑ پر پہنچ گئے۔ غروب آفتاب کا وقت قریب تھا۔ لارڈ میو صاحب نے وہاں بیٹھ کر سمندر میں غروب آفتاب کا نظارہ دیکھا اور کہا کہ ایسا خوبصورت منظر میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ جب کافی اندھیرا چھا گیا تو مشعلوں کی روشنی میں نیچے اترنے لگے۔ اس وقت چاروں طرف پولیس کا مسلح پہرہ تھا، چیف کشر، پرائیویٹ سیکرٹری بدن سے بدن ملائے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں دوسرے بسیوں افسر بھی ان کے آگے پیچھے چل رہے تھے اور لارڈ صاحب خیریت سے ہوپ ٹون کے گھاٹ تک پہنچ گئے۔ جب گھاٹ کے قریب کھڑی ہوئی گاڑی کے نزدیک پہنچے، تو چیف کشر اجازت لے کر کسی مزدور کی وجہ سے پیچھے چلے گئے۔ لارڈ صاحب

اور پرائیویٹ سیکرٹری خزاں خزاں جا رہے تھے۔ جب گاڑی کے قریب پہنچے تو شیر کی طرح کوکڑا اس نے لارڈ صاحب کو پھری سے دو ایسے کاری ضرب لگائے کہ وہ لڑکھڑاکر سمندر میں جا گرے۔ اس گڑبڑ میں تمام شعلیں بھی گل ہو گئیں لیکن ایک دوسرے قیدی نے جرأت سے کام لیتے ہوئے قاتل کو پکڑ لیا ورنہ وہ شاید دو چار اور کو بھی زخمی کرتا۔ لارڈ صاحب کو سمندر سے نکال اسی گاڑی پر لٹا دیا گیا، مشکل سے ایک دو باتیں ہی کرنے پائے تھے کہ راہی ملک عدم ہو گئے۔

شیر علی، تختہ دار پر | قاتل سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: ”خدا کے حکم سے“ پھر پوچھا گیا کہ کیا تمہارا کوئی اور بھی شریک ہے؟ خدا میرا شریک ہے۔“ اس کا جواب تھا تحقیقات کے بعد بنگال ہائی کورٹ کے فیصلہ کے مطابق قاتل کو تختہ دار پر لٹا دیا گیا۔

قاتل شیر علی ضلع پشاور کا افغان تھا۔ اس نے بتایا کہ ۱۸۶۹ء سے میرا زادہ تھا کہ کسی بڑے انگریز افسر کو ماروں گا۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے کئی سال سے یہ پھرتا رہ کر رکھا تھا۔ ۸ فروری ۱۸۷۱ء کو جب لارڈ صاحب آئے اور انہیں توپوں کی سلامی دی گئی تو میں نے پھر سے کو دوبارہ تیز کیا اور سارا دن تک میں رہا کہ بک اس ٹاپو میں پہنچوں، جس میں لارڈ صاحب مجھے ملیں۔ مگر مجھے رخصت نہ ملی۔ شام کے وقت جب میں مایوس ہو گیا تو تقدیر لارڈ صاحب کو میرے گھر لے آئی۔ پہاڑ پر بھی لارڈ صاحب کے ساتھ گیا تھا اور ساتھ ہی واپس آیا لیکن کہیں موقع میسر نہ آسکا۔ پھر میں گاڑی کی آڑ میں آکر چھپ گیا اور یہاں میری دلی مراد پوری ہو گئی۔

یہ شخص گوضیف الجشہ، پست قد اور بد صورت تھا لیکن بڑا شر زور اور دلیر تھا۔ تختہ دار پر بٹختے وقت بالکل ہراساں نہ تھا بلکہ با د ا ز بند قیدیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ”بھائیو! میں تمہارے دشمن کو مار دیا ہے، تم گواہ ہو کہ میں مسلمان ہوں“، پھر وہ کمرے پڑھنے لگا اور کمرے پڑھتے پڑھتے ہی رُوحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس ادنیٰ درجہ کے قیدی کے ہاتھوں لارڈ صاحب کا قتل قدرتِ الہی کا ایک نمونہ

تھا ورنہ کہاں گنگویتی اور کہاں راجہ بھوج۔ جب پیام اجل آپہنچا تو یہ عد ہما فظ مستح پولیس اور حفاظت کا دیگر ان گنت سامان کچھ کام نہ آیا۔ وہ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، اس کی قدرت میں کسی کو دخل نہیں۔

اس واقعہ سے ایک ماہ قبل ایک اور پشادری افغان نے چیف جسٹس نارمن کو اسی طرح کلکتہ میں پھرے سے قتل کر دیا تھا۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ ان وحشت ناک اور بربت انگیز واقعات کے بعد انگریز پٹانوں کے دشمن ہو جاتے لیکن میں نے دیکھا کہ صاحب لوگ پہلے کی نسبت انگریزوں کی دو چند خاطر داری کرنے لگ گئے اور پٹانوں کے بجائے بلیسیب و ہابیوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگ گئے۔ آہ! مارنے والے سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور غریب پر ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔

اس سے زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ لارڈ صاحب کے اس قتل کے بعد ہیٹ صاحب کشر پولیس کلکتہ اور

ایشری پر شاد کی سازش

لارڈ ایشری پر شاد — ہمارے پرانے دوست جو ہم پر الزام لگا کر سارجنٹ سے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے

تھے — اور چند نامی گرامی پولیس افسر ہندوستان سے یہ غم لے کر پورٹ بلیر پہنچے کہ ہم اس

متنبہ ہوا ہابیوں کو ضرور پھنسا دیں گے لیکن اللہ کے فضل سے اس وقت پورٹ بلیر میں جنرل

اسٹوارٹ اور پرائیوٹ ایسے ہوشیار اہل بیدار مغز افسر موجود تھے، جو ہمارے حالات، چال چلن، اس

قتل کی کیفیت اور قاتل کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس وجہ سے اس مرتبہ ایشری پر شاد

کو ناکام واپس لوٹنا پڑا ورنہ اس نے آتے ہی بھوٹے گواہ بنانا شروع کر دیئے۔ جنرل اسٹوارٹ

کو جب معلوم ہوا تو اس نے کہا ہم ان وہابیوں سے بخوبی واقف ہیں لہذا جھوٹی شہادتوں پر بیٹھی کسی

نا جائز کارروائی اپنے علاقے میں ہم ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ اللہ رب العزت نے

اس ناگہانی آفت سے محفوظ رکھا اور اصل مجرم ہی سزا یاب ہوا۔

لارڈ میو کے قتل تک میں انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہو

چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک انگریزی نواں لام سروپ کی خبر

انگریزی زبان کی تعلیم

سے میں نے انگریزی زبان سیکھنی شروع کر دی تھی اور ایک سال کی محنت ہی سے مجھے لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں خوب مہارت ہو گئی تھی۔ فرصت کے لمحات میں لوگوں کو اردو، فارسی اور انگریزی بائیں سکھایا کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان سے کثرتِ اختلاط کے باعث میری انگریزی کی استعداد بہت بڑھ گئی۔ اس وقت وہاں کاتبوں کی قلت تھی لہذا سرکاری ملازموں کو غرائض نویسی اور اپیل نویسی وغیرہ کی بھی ممانعت نہ تھی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بھی عرضی و اپیل نویسی کا شغل جاری رکھا اور جب انگریزی میں لکھنے کی استعداد پیدا ہو گئی تھی، تب سے انگریزی میں کامنا شروع کر دیا تھا، اس سے علمی استعداد میں ترقی کے علاوہ ہزاروں روپے کا مادی فائدہ بھی ہوا۔ پچاسویں انگریزوں کی معلمی اور غرائض نویسی سے سو روپیہ ماہوار اجرت ملی کہ لیتا تھا۔ کالانی میں میرے علاوہ اور کوئی مسلمان انگریزی خواں نہ تھا، اس لیے میں نے اس علم کی بدولت مسلمانوں کے بعض بڑے بڑے اہم مقدمات میں ان کی بہت مدد کی، بڑی بڑی آفتیں اور مصیبتیں دور کرائیں اور بہت نفع پہنچایا، جسے مدتِ مدید اور عرصہ بعید تک فراموش نہ کیا جاسکے گا۔ میری انگریزی دانی کی وجہ سے جن کی پچانسی موقوف ہو گئی اور جان بچ گئی، وہ تو ناز نیست اس احسان کو نہ بھولیں گے۔ یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ جس دن میری رہائی کا حکم پہنچ کر مشہور ہوا، اسی دن سے سرکاری ملازموں کے لیے غرائض نویسی کی قطعی طور پر ممانعت ہو گئی اور اب تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ اگر کوئی سرکاری ملازم بھول کر بھی عرضی لکھ دیتا تو اسے ملازمت سے فوراً برخواست کر دیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر نوازشات کی طرح یہ اجازت بھی خاص میرے ہی لیے تھی۔

انگریزی سیکھ کر میں نے بڑے بڑے کتب خانوں کی سیر کی، ہر علم و ہنر کی صد ہا کتابوں کا مطالعہ کیا، دنیا کی کوئی زبان ایسی نہ ہوگی، جس کی صرف و نحو انگریزوں نے لکھی ہو، کوئی ملک نہ ہوگا، جس کی تاریخ نہایت شرح و بسط کے ساتھ انگریزی میں نہ ہو۔ انگریزی زبان علوم فنون کا سرشہ ہے۔ جو یہ زبان نہیں جانتا وہ حالاتِ دنیا سے بے خبری واقع نہیں ہو سکتا، اس زبان کے واکچے نے کسے لیے آج کوئی آلہ زہ نہیں ہے۔

جس طرح یہ زبان دنیوی فوائد کے لیے نہایت مفید ہے، اسی طرح دین کے لیے منہج بلکہ ستم قاتل ہے۔ کوئی جوان لڑکا جس نے پہلے قرآن وحدیث اور سلوک راہ نبوت میں مہارت حاصل نہ کی ہو، وہ انگریزی زبان سیکھ کر مختلف علوم وفنون کا مطالعہ کرے تو پرلے درجے کا بے حد آزاد، بے دین، بے ادب اور ملحد ہو جائے گا۔ بلکہ ایسا بے دین اور ملحد ہو گا کہ پھر اس کا سنوٹا محال ہی بنیں ناممکن ہو گا۔

مغربی علوم کا ملحدانہ اثر | صرف انگریزی زبان کا سیکھنا مضر نہیں بلکہ منہج رساں بات یہ ہے کہ علوم وفنون کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو

انبیاء کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ خصوصاً جو لوگ اصول دین کی واقفیت نہیں رکھتے ان کے دل میں تو مغربی علوم وفنون کے مطالعہ سے تشکیک کے ایسے کانٹے پیدا ہو جاتے ہیں جو کبھی نہیں نکل سکتے۔ اس مرض یا دل کی موت کے باعث عبادت سے بھی بہت غافل ہو جاتے ہیں۔ گویا ہری طور پر اسلام کے لاکھ دعوے کریں لیکن درحقیقت وہ اسلام سے منہ موڑ چکے ہوتے ہیں۔ میرا اپنا حال کچھ اس طرح کا ہو گیا کہ میری نماز تہجد یک قلم چھوٹ گئی حالانکہ یہ بچپن سے میرا معمول تھا۔ رات کو معمول کے مطابق بیدار تو ہو جاتا لیکن دو بجے سے فجر تک چار پائی پر بٹھا رہتا، ہمت نہ پڑتی کہ وضو کر کے نماز شروع کر دوں۔ اسی طرح جمعہ اور باجماعت نماز ادا کرنے میں بھی غفلت کا شکار ہونے لگا حتیٰ کہ قرآن وحدیث کے پڑھنے اور سننے کا بھی وہ شوق نہ رہا جو کبھی تھا۔ رمضان المبارک میں بھی قرآن مجید کی تلاوت بہت گراں گزرنے لگی۔ ایک وقت تھا کہ ہاتھ اٹھا کر گھنٹوں دعائیں مانگا کرتا تھا مگر اب کیفیت یہ ہو گئی کہ چار کلے بھی زبان سے نہ نکلتے کہ ہاتھ خود بخود نیچے گر جاتے۔ فرض نماز بچکانہ ادا تو کرتا تھا مگر یہ کام مجھے پہاڑ سے بھی زیادہ سخت معلوم ہوتا۔ قریب تھا کہ میں فرض نماز روزہ کو بھی جواب دے دوں۔ ان کے عبث ہونے اور ترک کر دینے کے دلائل بھی شیطان نے مجھے سکھانے شروع کر دیئے تھے۔

قرآن مجید کے تین پارے مجھے حفظ تھے، ان میں سے آخری چند سورتیں یاد رہ گئیں باقی

سب بھول گیا۔ صد ہا حبشیں یا دھتیں وہ بھی گویا دل سے کسی نے دھو ڈالیں۔ ان برسے عقائد و اعمال سے میرے دل پر زنگ لگنا شروع ہو گیا سخی کیزرادل مرین ہو گیا اور پھر تو نوبت بایں جا رہی کہ دل پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی اور قریب تھا کہ دل مردہ ہو جائے اور اس پر طرہ یہ کہ اس حالت میں شیطان میرے دل میں ایسی ایسی وجوہات منقش کرتا، جن کی وجہ سے میں اپنی اس حالت کو سب سے بہتر جانتا اور سمجھتا تھا کہ جنت میں جانے کے لیے صرف کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کافی ہے اور یہ سب نکالیف شرعیہ بے فائدہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ گا ہے گا ہے حق تعالیٰ کی طرف سے شیطان کی ان سازشوں کے متعلق بھی مجھے القاء کیا جاتا لیکن اس کے باوجود دل لمحوں اور دہریوں کے دلائل کی طرف مائل ہو جاتا تھا الغرض مجھ میں اور کفر میں صرف چند انگشت کا فرق باقی رہ گیا تھا۔ یہ کیفیت ایک دو دن نہیں بلکہ عرصہ دراز تک رہی۔ شاید سابقہ اعمال صالحہ کا اثر تھا کہ مجھے اپنی اس ہلاکت آفریں کیفیت کا احساس ضرور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احساس جب شدت اختیار کر جاتا تو میرے منہ سے بے اختیار دعائیں بھی نکلتی تھیں کہ ”اے آنکھ والے! مجھ اندھے کا ہاتھ کپڑ۔“

آخر کار اللہ کی رحمت کا دریا جوش میں آیا اور میری توبہ کے سامان فراہم ہو گئے۔ ہوا یہ کہ فکس ۸۸۸ میں ایک شدید ذہل کے عارضہ میں مبتلا ہو کر سخت بیمار ہو گیا، جس کے باعث سب کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔ ڈیڑھ مہینے تک اس ذہل سے یروں پیپ جاری رہی، پانچ ہفتہ تک ہسپتال میں پڑا رہا، مرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ گیا تھا، دوست آشنا سب مایوس ہو گئے اس حالت میں میں نے گواہا کر اللہ کے دروازے پر دستک دی اور اپنی حالت سے منفضل ہو کر سچی توبہ کی اور عہد کیا کہ اس بیماری سے شفا پاتے ہی نماز تنبیہ شروع کر دوں گا اور قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی کیا کروں گا۔

مجھے اسی وقت سے قبولیت دعوے کے آثار نظر آنے لگے، دل کی حالت پلٹ گئی اور اللہ کی رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ بھولا ہوا قرآن و حدیث اور ادعیہ ماثورہ یاد کرنے لگیں

نماز اور دعائیں بھی لذت و صلاوت محسوس ہونے لگی۔ اس کیفیت کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ یہ بیماری تو محض میری اصلاح اور تربیت کے لیے تھی ہسپتال سے واپس آ کر پھر از سر نو قرآن و حدیث کا مطالعہ شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں میری حالت پہلے سے بھی اچھی ہو گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ جس قرآن و حدیث کے پڑھنے سے طبیعت گجراتی اور ثقیل ہوتی تھی اور ایک دو آیت پڑھنا بھی محال اور دشوار ہوتا تھا، اب دن بھر بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور اس سے طبیعت کو ستر اور دل کو لذت نصیب ہوتی ہے اور وہ دعا جس کے لیے ہاتھ اٹھانا محال تھا، اب گھنٹوں مانگنے سے بھی میر نہیں ہوتا۔ اس کی کیفیت میں مجھ پر یہ عقہہ بھی کھلا کہ عبادت اور اطاعت کی توفیق دینا بھی اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے۔

مجاہدین کے خلاف سرکار ہند کی پالیسی تہذیبیت معاندانہ تھی۔
مجاہدین اور سرکار ہند ۱۸۶۳ء میں دہلیوں کی گرفتاری کی جو آگ تھا میر میں روشن

ہوئی تھی، وہ تیز ہوتی گئی اور ہر طلوع ہونے والا سورج اس کی تیزی کا پیام لے کر اُفق پر نمودار ہوتا ہمارے ہندو اور بعض مسلمان بھائی اس آگ کو بجھانے کے بجائے اس میں تیل اور تار پین ڈال کر بڑھاتے گئے۔ آخر کار ڈاکٹر ہنٹر نے اس جلتی ہوئی آگ پر ہزاروں من ولایتی بارود اور مٹی کا تیل ڈال دیا اور ہماری سرکار کو یہاں تک بھر کا یا کہ اس نے صادق پور پٹنہ کے دہلیوں کے ان مکانات کو نہ صرف پویند زمین کر دیا بلکہ زمین سے ان کی بنیادوں کو کھدوا کر دوڑھینکا دیا، جن میں اس کا قافلہ حریت کے لوگ ٹھہرا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی سرکار کی آتش انتقام سرد نہ ہوئی۔

OUR INDIAN MUSLIMANS

ڈاکٹر ہنٹر کی رسوائے زمانہ کتاب

کی طرف اشارہ ہے، جس میں اس نے شرافت اور انسانیت کے تمام تقاضوں کو بلائے طاق رکھتے ہوئے مجاہدین کے خلاف بنایت بے سرو پا باتیں لکھیں، جن سے مشعل جو کہ انگریزوں نے مجاہدین کو آلام و مصائب کا اس قدر مخمخہ مشق بنایا کہ الامان والخیفۃ لہ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے مولانا عبدالرحیم مرحوم کی کتاب ”تذکرہ صادقہ“، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی ”ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک“

پٹنہ اور بنگال میں گرفتاریاں

۱۸۷۲ء کے آخر تک پٹنہ اور بنگال میں بے گناہوں کی گرفتاری کا سلسلہ جاری رہا۔ امیر خاں سوداگر چرم اور

مولوی تبارک علی کے علاوہ دیگر بے شمار آدمی پٹنہ میں دھریے کئے۔ مولوی امیر الدین صاحب کو پنہ اور ایک بوڑھے شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور سے گرفتار کر دیا گیا اور اپنے سمو لی اور پڑا نے گواہوں سے اپنی مرضی کے مطابق شہادت حاصل کر کے، ان بے چارے مظلوموں کو سسٹے کالا پانی روانہ کر دیا گیا۔

حکومت نے اپنا تمام خرچ امیر خاں کی جائیداد فروخت کر کے سائل کر لیا۔ اگرچہ اسے بھی حبس دوام کی سزا دی گئی تھی لیکن چار سال بعد مفت کا احسان کر کے اسے چھوڑ دیا اور اس غریب کی ضبط کی ہوئی جائیداد میں سے ایک پائی بھی اسے واپس نہ کی۔ ذرا غور فرمائیے کہ اگر امیر خاں اتنا بھاری مجرم تھا جیسا کہ مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے تو اسے چار برس بعد کیوں رہا کر دیا گیا؟ اور اگر وہ قصور وار نہیں تھا جیسا کہ اس کی رہائی سے معلوم ہوتا ہے، تو اتنے شدید انتہام سے اس غریب کی جائیداد فروخت کرنے اور اسے پابند زنجیر و سلاسل کرنے کا کیا جواز تھا؟

مازج ۱۸۷۲ء میں مولوی تبارک علی صاحب اور مولوی امیر الدین صاحب ہمارے پاس کالا پانی پہنچ گئے۔ قانون جدید کے جاری ہونے کی وجہ سے ان بے چاروں کو ایک مدت تک سخت مشقت کرنا پڑی۔ پھر اللہ کا فضل ہوا اور مولوی تبارک علی صاحب اسٹیشن مقرر اور مولوی

لے مولوی تبارک علی بن مولوی مبارک علی دونوں باپ بیٹے تحریک جہاد میں کام کرنے کے اعتبار سے شعلہ ہوالہ سے کھڑے تھے۔ مولوی تبارک علی صاحب پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے بنگال میں مولانا عبد اللہ صاحب کے ساتھ شرکت کی اور ایک دستے کی کمان بھی کی۔ ۱۸۷۲ء میں آپ کو حبس دوام عبور دیا گئے شور اور چلے جائیداد کی سزا دی گئی اور ۱۸۷۳ء میں رہائی ہوئی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۵۹۔

امیر الدین صاحب قلم مدد راسخ رہے ہو گئے۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد لاڈل پرن کے حکم سے ہمارے ساتھ ہی رہا ہو گئے گو ایام قید کم تھے لیکن مشقت کی منتی کی وجہ سے گویا ہمارے برابر ہو گئے تھے۔ جب دس برس تک بھی وہابیوں کی قید و بند کا یہ سلسلہ بند نہ ہوا، تو میں اپنے بڑے اعمال کو یاد کر کے بہت کڑھا کرتا تھا کہ یہ آگ میرے گھر سے نکلی اور میری بد اعمالیوں کی وجہ سے دس برس تک تمام ہندوستان میں جلتی رہی اور ہزار ہا علماء و شرفاء اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ اے کاش! مجھ سانھوس اور بد بخت پیدا نہ ہوتا یا بچپن ہی میں میرا تا تو مسلمانوں پر یہ آفت نہ ٹوٹتی۔

چو از قوے یکے بید انشی کرد

نہ کہہ را منزلت ماند نہ مرا

مارچ ۱۸۵۲ء میں جس جہاز میں مولوی تبارک علی اور مولوی امیر الدین آئے تھے، اسی جہاز سے میاں عبدالغفار کی بیوی اور دو بچے بھی جکیم سرکار کا لاپانی پہنچے۔ میاں عبدالغفار نے چیف کسٹرن پورٹ بلیر کے ذریعہ گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ ان کے بیوی اور بچوں کو ہندوستان سے بلا دیا جائے۔ گورنمنٹ بنگال شکریہ کی مستحی ہے کہ اس نے ایسے ”باغی“ کے بیوی بچوں کو اپنے قریب پر کال لاپانی بھیج دیا۔

اتنے شدید غیظ و غضب سے، مسلسل دس برس تک وہابیوں کے دھڑا دھڑا گرفتار کر کے دریا برد کرنے سے انگریزوں کی سرکار کا مقصد یہ تھا کہ ان فرزند ان توحید کا ہندوستان کی سرزمین سے قلع قوع کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہیں ریخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے لیکن جسے خدا رکھے اسے کون کہے میں نے کال لاپانی سے واپس آکر دیکھا کہ جب میں ہندوستان سے رخصت ہوا تھا تو سارے پنجاب میں وہابی ستیہ کے دس مسلمان بھی نہ تھے لیکن اب دیکھتا ہوں کہ پنجاب کا کوئی حصہ میاں عبدالغفار و لدیگل صادق پور کے باشندے تھے۔ مولانا احمد انڈیا مولانا عبدالرحیم کے ملازم تھے۔ مولانا احمد انڈیا مولانا عبدالرحیم کے ملازم تھے۔ مولانا احمد انڈیا مولانا عبدالرحیم کے ملازم تھے۔ مولانا احمد انڈیا مولانا عبدالرحیم کے ملازم تھے۔

کے نزدیک پرورش اور مجلس کا رکھ تھے۔ ۳۵ برس کی عمر میں کال لاپانی پہنچے اور ۵۳ برس کی عمر میں رانی ہوئی۔

۱۹۱۲ء کے قریب راہ گرائے عالم جاوداں ہو گئے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۱۳۳۔

شر، قصبہ اور گاؤں ایسا نہیں جس میں چوتھائی حصہ وہابی نہ ہوں۔ جو امام محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے متفقہ میں اور یوگائیو گاؤں اور فرزانوں کی یہ جماعت ترقی کر رہی ہے۔ یورپ میں پرائیوٹ فریق پر جب عتاب نازل ہوا تو کوئی عذاب، شکنجہ، سٹولی، پھانسی، جلا وطنی اور آگ ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ بنی۔ یہی کیفیت یہاں تھی۔ تہذیب سے ثابت ہے کہ کسی فرقہ کی ترقی کو روکنا اور اس پر تشدد کرنا اس کی ترقی اور جہاد و جلال کا سب سے مضبوط مسبب ہو کرتا ہے۔

دور کیوں جائیں تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ جب سکھ فرقہ پیدا ہوا اور کس نے بال و پرنکالے شروع کیے تو مغلوں نے ان کے نیست و نابود کرنے کے لیے کیا کیا نہ کیا مگر خدا کے بڑھائے کو کون گٹھا سکتا ہے۔ آخر وہی سکھ ہیں جنہوں نے پشت اور سے دہلی تک مغلوں کی سلطنت چھین لی اور سو برس تک جلال و اقبال سے حکومت کی۔ ادھر دکن میں مرہٹوں کا یہی حال تھا جتنا رد کا اتنا ہی بڑھتے گئے۔ خدا تعالیٰ کی حکمت بالغہ میں دست اندازی کرنا، اپنے لیے ہلاکت کے سامان فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

اولاد ۱۲ اپریل ۱۸۶۲ء کو میری بڑی لڑکی پیدا ہوئی، اس کا حقیقہ بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ مولوی امیر الدین صاحب اور مولوی تبارک علی صاحب، جن کو یہاں پہنچے ہوئے صرف پندرہ روز ہوئے تھے، انہوں نے بھی اس دعوت حقیقہ میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد میری دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ محبت کے مارے میں نے اس کا نام اپنی ہندوستان والی لڑکی کے نام پر رکھا۔ اس کا حقیقہ بھی پہلے کی طرح بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ اس کے بعد تیسرا بچہ ۲۶ نومبر ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوا۔ اس کا نام بھی میں نے اپنے ہندوستان کے لڑکے کے نام پر محمد صادق رکھا۔ اس لڑکی کی پیدائش کے وقت ایک عجیب سرائی ظاہر ہوا، جو غالباً میری تسلی کے لیے تھا وہ یہ کہ جس دن یہ لڑکا کالا پانی میں پیدا ہوا، اسی دن بلکہ اسی وقت میرا بڑا لڑکا محمد صادق پانی پت

بے امام محمد اسماعیل شہید کے مفصل سوانح حیات کے لیے ملاحظہ فرمائیے ”تذکرہ شہید“ از محمد خالد سیف

میں فوت ہوا تھا۔ جب اس کی وفات کی خبر پہنچی، تو میں نے اس کا نعم البدل اور اس کا ہم نام اپنے پاس پا کر صبر و شکر کیا اور اس کی والدہ کو بھی اس کے نعم البدل اور ہم نام مل جانے کی خبر لکھ بھیجی۔

جب میں نے انگریزی سیکھی تو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب **OUR INDIAN MUSLMANS** دیکھنے کا بڑا شوق پیدا ہوا، تو بڑی مشکل سے سات روپے

ہنٹر کی کتاب

میں لکھتے سے ایک نسخہ منگوایا۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔ جب میں نے کتاب کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ ایک مقام پر ڈاکٹر ہنٹر نے بڑی لمبی چوڑی تنقید بانٹ کر لکھا انگریزوں نے ترجمہ خسر و اندر سے کام لیتے ہوئے وہابیوں کو کبھی کالا پانی سے رہا بھی کر دیا تو وہ اپنی اس رہائی کو اللہ جل جلالہ کی جانب سے سمجھتے ہوئے جب واپس ہندوستان آئیں گے، تو انگریزی حکومت کے لیے پہلے کی نسبت زیادہ تخریب و بربادی کا موجب ہوں گے۔ یہ بکا کا اعتصاب اور غصہ دیکھ کر ہم تو پہلے ہی رہائی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، یہ زہر آئینہ صنمون پر اٹھ کر رہی مہی امید بھی جاتی رہی۔

جب گورنمنٹ ہند نے ان دائم الجس قیدیوں کی رہائی کا حکم جاری کیا جنہیں قید ہونے بیس سال گزر چکے تھے، تو ہمارے کہیں کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس سب سے بڑھ کر ناامیدی اس وقت ہوئی جب ۱۸۸۱ء میں خود ڈاکٹر ہنٹر گورنر جنرل ہند کے مصاحب مقرر ہوئے۔ ہم نے خیال کیا کہ جس شخص کی کتاب کو پڑھ کر دانا سے دانا انگریز گمراہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارا دشمن ہو جاتا ہے تو محکمہ گورنری میں اس کی موجودگی کیا کیا گئی نہ کھلائے گی؟

لیکن بایں ہر غیبی طور پر دل میں الہام ہوا کہ ہم جلد رہا ہو کر ہندوستان جا رہے ہیں؛ چنانچہ میں نے مولوی انوار الاسلام اور حافظ محمد اکبر

رہائی کی امیدیں

لے یاد رہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۷ء اور دوسرا ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔

بانی پی کو خطوط بھی لکھ دیئے تھے کہ میں جلد ہندوستان آیا چاہتا ہوں۔

جون ۱۸۸۱ء میں خاکسار کا پورٹ بلیر کے جنوبی حصہ ابرڈین میں تبادلہ ہو گیا اور وہاں میں اپنے پرانے آقا اور شاگرد میجر پراختر و صاحب ڈپٹی کمشنر کامیشی متقرر ہوا اور ربائی و روانگی کی تاریخ تک اسی عہدہ پر متعین رہا۔

پراختر و نے میری اعانت سے پورٹ بلیر کے لیے آئین کی کتاب بھی لکھی جو گورنمنٹ کی منظوری کے بعد مشترک کی گئی، اس کا اردو ترجمہ بھی میں نے کیا تھا اور وہ بھی چھپ چکا ہے اسی صاحب نے میری چودہ برس کی ~~کارنامہ~~ اریوں اور جانفشانوں پر نظر تو جمع کرتے ہوئے میری ربائی کے لیے گورنمنٹ ہند کو بڑی دھوم دھام سے ایک رپورٹ بھیجی۔ اس رپورٹ پر ربائی کو کیا ہوئی البتہ سیکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ اس قدر ناراض ہوئے کہ تازہ سبست ربائی نامکن ہوئی اور دوبارہ کسی افسر کے لیے میری ربائی کی رپورٹ کرنے کا حوصلہ ہی باقی نہ رہا۔ ۱۸۸۰ء کے

آخر میں مولانا عبدالرحیم کے صاحبزادے مولانا عبدالفتاح صاحب اپنے والد ماجد کی ملاقات کے لیے پورٹ بلیر پہنچے اور کوئی سال بھر رہنے کے بعد واپس چلے گئے۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اپنے بیٹے کو ایک درخواست لکھ کر دی، جو ان کی بیوی کی طرف سے لکھی گئی تھی۔ یہ درخواست اپریل ۱۸۸۲ء میں گورنر جنرل ہند کے نام ارسال کی گئی۔ درخواست میں بیان کیا گیا تھا کہ :-

”میرے شوہر کو کوئی بھاری قصور ثابت نہ ہو سکا تھا۔ اس لیے جب مقدمہ سیشن جج اور ججیت کورٹ میں پیش ہوا تو کہا گیا تھا کہ عبدالرحیم نے الزمیک جلی کا ثبوت دیا تو مقدمہ پرنظر ثانی کی جائے گی مگر اب تو ۴۲ کے بجائے ۱۸ برس ہو چکے ہیں میں نے اس کی جدائی میں بہت تکلیف اٹھائی ہے اور وہ بھی بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ لہذا سرکار کو چاہیے کہ اس کے مقدمہ کی مثل ملاحظہ کرنے کے بعد اسے ربائی بخش دے۔“

اس درخواست کے ملاحظہ کرنے کے بعد لاڈلہ پرن نے مثل مقدمہ کو طلب کیا نیز پنجاب اور کال کی گورنمنٹ سے رائے طلب کی کہ اگر ان وہابیوں کو رہا کر دیا جائے تو اس میں کچھ قباحت تو

نہیں، ہر لوکل حکام کی آراء کے انتظار رکھے لیے مقدمہ کو آئندہ سال کے آغاز تک ملتوی کر دیا گیا۔ یہ درخواست صرف مولانا عبدالرحیم صاحب کے لیے تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا قصور بھی نہ تھا۔ انہیں تو صرف فرغی مفسدوں کی اولاد ہونے کے جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا اس لیے ہمیں صرف ان کی رہائی کا انتظار تھا۔ اس ذریعہ سے اپنی رہائی کا تو گمان بھی نہ تھا۔ خصوصاً اس صورت حال میں جب کہ ان حوٹوں بنگال کو رکھے سب صاحب لوگ پورٹ بلیر میں جمع ہو گئے تھے اور ہم سے نہایت تعصب سے پیش آتے تھے۔

۱۸۸۱ء میں پیری اور ضعف کی وجہ سے مولانا احمد اللہ صاحب کی حالت زیادہ ہی قابل رحم ہو گئی تھی۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔ انہوں نے اپنی حالت زار کے پیش نظر کلکتہ میں مقیم اپنے صاحبزادے مولانا محمد یحیٰ صاحب کو بلانا چاہا اور پورٹ بلیر کے قاعدہ عام کے مطابق یہ ملاقات جائز اور درست تھی اور سینکڑوں بیٹے اپنے اپنے باپ سے آکر مل گئے تھے مگر صرف اس وجہ سے کہ احمد اللہ وہابی ہے، ان کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔

اس آشنا میں میں نے بھی بطور امتحان ایک درخواست بھیجی کہ محمد رشید میرے حقیقی برادر زادہ کو میرے پاس پورٹ بلیر آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست بھی سراسر منغوری کے قابل تھی مگر صرف اس وجہ سے کہ سائل وہابی ہے، درخواست مسترد کر دی گئی۔

مولانا احمد اللہ کا انتقال

جب مولانا احمد اللہ صاحب نہایت کمزور اور چرپرہ سحری ہو گئے تو مولانا عبدالرحیم صاحب نے ان کی حالت بیان کر کے حکام کو لکھا کہ میں ان کا قریبی رشتہ دار ہوں۔ ویسے میں ان کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں لہذا انہیں ایڈمنسٹریشن میں میرے گھر رہنے کی اجازت دی جائے۔ یہ درخواست جس کے پڑھنے سے سنگ دل سے سنگ دل انسان کا دل بھی موم ہو سکتا تھا، محض اس وجہ سے مسترد کر دی گئی کہ احمد اللہ اور عبدالرحیم دونوں وہابی ہیں، ان کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہو سکتی۔ جب مولانا موصوف کی حالت نہایت تپلی ہو گئی اور انگریزوں کا تعصب شدت اختیار

آگیا تو مولانا عبدالرحیم نے یہ درخواست کی کہ انہیں رات کو دیرین مولانا کے پاس رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ بڑی رد و کد اور بحث کے بعد یہ درخواست منظور ہوئی اور مولانا عبدالرحیم ۲۰ نومبر کو شام کے وقت ایک تحریری پاس ملا اور اسی رات ۲۱ نومبر ۱۸۳۱ء (۲۸ محرم ۱۲۵۰ھ) شب و شنبہ کو ایک شبہ مولانا موصوف کی رُوح اس جسم قیدہ در قیدہ کوچھوڑ کر فردوسِ بریں پرواز فرمائی۔ **قَوِّدَ اللّٰهُ مَرْقَدَهُ وَبَرَّزَدَهُ مَنَاجِعَهُ۔**

مولانا کی وفات کے وقت اُن کا ایک ملازم ان کے پاس ہسپتال میں موبہ دیتھا۔ مولانا کی دُرسے بے ہوشی کے عالم میں تھے لیکن وفات کے وقت آپ نے آنکھ کھول کر: **”اِلَّا اللّٰهُ مَا لَكَ هَلَكُ“** آخری کلمہ زبان سے ادا فرمایا اور اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۲۱ مارچ کو آٹھ بجے صبح ہمیں ابرو دین میں آپ کی وفات کی اطلاع ہوئی تو ہم سب بہت سے غم کے ساتھ نونہ کے دیپر پہنچ گئے۔ میں چونکہ ضلع کچہری میں منشی تھا اس لیے صلحدار کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ حکام کے تعصّب کی وجہ سے اجازت کا ملنا بھی محال تھا لیکن آپ کی تجویز و تکفین میں شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں اللہ پر توکل کرتے ہوئے اجازت کے بغیر ہی دیپر لایا اور ایک درخواست بھیج دی کہ میں مولانا احمد اللہ صاحب کی تجویز و تکفین میں شرکت کے لیے دیپر جا رہا ہوں لہذا میری آج کی غیر طاعری کو معاف فرما دیا جائے۔

دیپر پہنچ کر ہم نے انگریزی حکام سے یہ درخواست بھی کر دی تھی کہ ہمیں اجازت بخشی جائے کہ مولانا اللہ صاحب کی لاش کو بھو دین لے جا کر ان کے حقیقی بھائی مولانا بیگم علی صاحب کی قبر کے قریب دفن کر دیں یہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی تو مجبوراً غسل اور نازِ جنازہ کے بعد دُعا سے بٹ کے گورنر خیالید میں جو کہ دیپر سے تھوڑی دُور ہے انہیں پُرسوں کا کر دیا گیا۔

اپنے ان بیس سالہ تجربات سے یہ بھی سیکھا کہ جب کبھی میں نے کسی حاکم یا افسر پر پھر دُور کیا اور خدا کی طرف توجہ نہ دی تو میرے اللہ نے اسی خیالی معاون کے ہاتھ سے مجھے ایذا پہنچانے کا بندوبست کر دیا مگر جب میں نے اس خیال سے تائب ہو کر، اس ذاتِ وحدہ لا شریک کی

طرف رجوع کیا تو اس نے میری مدد فرمائی اور آفت سے نجات بخشی اور جو لوگ پہلے سے میرے دشمن تھے اور جن سے میں ڈرتا تھا، انہی کو میری مدد اور پشت پناہی کے لیے کھڑا کر دیا۔

خدا تعالیٰ کو یہ کسی طرح بھی منظور نہیں ہے کہ میں اس کی طرف سے غافل ہو کر غیر اللہ کی طرف رجوع کروں۔ وہ رب العزت ہمیشہ مار مار کر اور تنبیہ کر کے مجھے شرک سے بچاتا، اور اپنی طرف رجوع کرتا رہا ہے۔

ستمبر ۱۸۸۲ء میں میری بیوی نے پانی پت سے خط لکھا کہ میری بڑی لڑکی جوان ہو گئی ہے تمہاری رہائی کی امید پر آج تک اس کی شادی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ تمہاری جلد رہائی کی اب بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی اگر آپ اجازت دیں تو کسی جگہ اس کی شادی کا بندوبست کر دیا جائے نیز اس کا غیر کے لیے آپ کچھ ضروری خرچ بھی بھیج دیں۔ میں نے حکم رہائی کی تاریخ سے اڑھائی ماہ قبل ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو زیور اور پارچہ جات کے علاوہ تین سو روپے نقد بھی پانی پت بھیج دیئے اور اپنی بیوی کو لکھا کہ تم کسی دیندار مسلمان سے اس لڑکی کی شادی کر دو۔

جب میرا بھیجا ہوا مال اسباب اور خط پانی پت پہنچا تو اس کی شادی میں میرے شامل نہ ہونے کی وجہ سے خوشی کے بجائے ان لوگوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ میری بیوی اور لڑکی تو رورو کر یہ دعائیں کرتی تھیں کہ آسے قادرِ عظیم! اس کو بھی اس شادی میں شریک کر۔

اس وقت تک میری رہائی کا بظاہر کوئی سامان نہ تھا مگر اس مستجاب الدعوات نے **رہائی** اسی دم ان کی فریاد کو شرف قبولیت سے نوازا۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۸۲ء کو کسی درخواست سعی و کاوش یا سفارش کے بغیر میری رہائی ہو گئی اور مجھ سے بھی پہلے پانی پت میری بیوی کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اب جو میری رہائی کا زمانہ قریب آیا تو ہر وقت اپنی رہائی کا غم ظہور ہوتا تھا اور اس ملک کے تحفے تجارت جمع کر کے چلنے کیلئے بالکل تیار ہو گیا۔ اگرچہ بہت سے لوگ میرے مقدمہ اور محکمہ گورنری کی کارگزاری کو دیکھ کر میری اس تیاری پر تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آخر کار ۲۲ جنوری ۱۸۸۳ء بروز دوشنبہ ہمارا فی انگیبوٹ یہ حکم لے کر پہنچا کہ وہابی کیس میں مجرم بغاوت جس قدر

آدمی قید ہیں سب کو رہا کر کے ہندوستان روانہ کر دیا جائے ان کی لوکل گورنمنٹ ان کی سکونت کے لیے معقول بندوبست کرے گی۔ جب یہ حکم دیا گیا تو میرے علاوہ مولانا عبدالرحیم صاحب میاں عبدالغفار، مولانا تبارک علی، مولانا امیر الدین اور میاں مسعود گل اسس مندر کے چھ آدمی وہاں موجود تھے۔ چنانچہ سب کی رہائی ہو گئی۔

اخبارات کے ذریعے ہندوستان میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو اسلامی حیمت کے پیش نظر مسلمانوں کی تمام اسلامی انجمنوں اور مجلسوں نے لارڈ پرین کے اس ترجم خسرانہ کا بذریعہ میموریل شکریہ ادا کیا۔ جیسے ہماری گرفتاری پر تمام ہندوستان میں کھرام مچ گیا تھا، ویسے ہی اب گھر گھر خوشی اور شکرانہ کی مجلسیں منعقد ہوئیں اور لارڈ پرین کی مداحی اور شکر گزاری سے ہماری زبان اور قلم کبھی قاصر نہ رہے گا۔ جس کی اولوالعزم اور ترجمان پالیسی کے باعث ہمیں پھر سے ہندوستان دیکھنا نصیب ہوا۔

اسی عرصہ میں میرے ایک پڑا نے شاگرد پکستان ٹیل نے جو میری رہائی کے وقت کیمپ انبالہ میں مجسٹریٹ تھے، میری رہائی کی خبر سن کر مجھے لکھا کہ اگر تم میرے پاس رہنا قبول کرو تو میں گورنمنٹ سے اجازت لے کر تمہیں اپنے پاس بلا لیتا ہوں میں نے اس پیام کو تائید غریب سمجھ کر فوراً قبول کر لیا انہوں نے گورنمنٹ پنجاب سے اجازت حاصل کر کے اور خود میرے عناصن بن کر نگرانی کی تمام شرائط کو موقوف کر دیا۔

جب میری رہائی کا حکم پورٹ بلیر پہنچا تو میری چھوٹی بیوی جو کہ جس دوام میں گرفتار تھی، اسے ابھی قید ہوئے فقط چوڑ

رہائی کے انتظامات

برس ہوئے تھے اس لیے اسی انگریز میں گورنمنٹ کو اطلاع دی گئی کہ حسب نامہ جو جعفری بیوی رہا نہ ہوگی، وہ ہندوستان نہیں جاسکتا اور اپنی رہائی کا حکم پاسے ہی میں نے بھی گورنمنٹ پنجاب کو لکھا کہ یہاں میرا امنیہ عہدہ گھر موجود ہے، میں سو روپیہ ماہوار کا ملازم ہوں۔ ہندوستان میں یہ انکھر ہے اور نہ دیر اور غالباً یہاں آنے پر حکام پنجاب بھی مجھے ناجائز طور پر تنگ کیا کریں گے اور

مجھے قیدی سمجھ کر کوئی ملازمت بھی نہ دیں گے، اس وجہ سے مجھے امید ہے کہ آپ اجازت دیں گے کہ میں وقتاً فوقتاً ہندوستان جا کر اپنے بیوی بچوں کو دیکھ آیا کروں، اگرچہ چھپت کمشنر صاحب نے پورٹ بلیر میں میری ٹیک جہازنی اور عمدہ کارگزاری کو دیکھ کر سفارش کر دی تھی کہ محمد جعفر کے لیے خاص طور پر سرکاری وظیفہ مقرر کیا جائے تاکہ ہندوستان میں اس کی گزربسربوسے لیکن گورنمنٹ پنجاب نے میری اس درخواست کو نامنکور کر کے جبراً مجھے اور میرے بیوی بچوں کو ہندوستان بلایا اور ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ ہمیں پنجاب میں ملازمت دی جائے گی۔

۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم، میاں عبدالغفار، مولانا امیر الدین اور مولانا تبارک علی سونے ہندوستان روانہ ہوئے اور بحیرہ ہند میں تمام اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو میاں سودھی چلے گئے اور فقط اکیلا اپنی بیوی کی ربائی کے حکم کے انتظار میں رہ گیا۔ یکم مئی ۱۸۸۳ء کو میری بیوی کی ربائی کا حکم بھی آگیا مگر اس وقت میری بیوی چھ ماہ سے اسید سے تھی اور سمندر میں طوفانی موسم شروع ہو چکا تھا اس لیے میں نے نومبر ۱۸۸۳ء (محرم ۱۳۰۲ھ) تک پورٹ بلیر میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔ اس مدت میں میں نے اپنے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا اور اوسنے پوسٹ پیسج دیا۔

تعصب کی انتہا | التبر ۱۳۰۲ھ میں میں نے چاہا کہ اپنے چونی گھر کو مسجد بن کر دے بسبیل اللہ وقف کر دوں۔ سب مسلمان جو بغیر مسجد کے تکلیف اٹھاتے تھے اس خواہش سے بہت خوش ہوئے مگر ڈپٹی کمشنر ہرج صاحب نے اذراہ تعصب یہ رپورٹ بھیج دی کہ یہ شخص دیوانی ہے اور مسجد بھی دیوانیوں کے قبضہ میں رہے گی لہذا مسجد بنانے کی اجازت نہ دی جائے اس طرح وہی تعصب و بائیت اس کا رخنہ میں مانع ہوا۔

انڈمان کا انتظام حکومت | جیسا کہ میں نے پورٹ بلیر میں اپنی آند کا تذکرہ کرتے ہوئے یہاں کے جغرافیہ اور قدیم باشندگان کے حالات

بیان کیے تھے۔ اسی طرح اس مقام پر پورٹ بلیر سے روانگی کے ذکر سے قبل ساکنان پورٹ بلیر کے قوانین اور طرز زندگی پر کچھ روشنی ڈال کر اس جزیرے سے رنجست سفر باندھنا ہوں۔

یہ جزیرہ دوسرے جزیروں کی طرح گورنمنٹ کی مستقل ملکیت ہے چیف کمشنر صاحب کو اختیار ہے جو قانون چاہے بنائے، جسے چاہے دیوانی و فوجداری اختیارات کا قلم دان سونپ دے۔ چیف کمشنر ہی یہاں کاسیشن بنج بھی ہے اور اس کا حکم ناظر ہے اس کے بعد اپیل نہیں ہو سکتی۔ صرف مقدمات پچاسی کے لیے گورنر جنرل کے اجلاس کونسل کی اجازت ضروری ہے۔ دیگر سب امور میں خواہ دیوانی ہوں یا فوجداری چیف کمشنر ہی ذاتی کورٹ کے فرائض سرانجام دیتا ہے چیف کمشنر کی اجازت کے بغیر یہاں سے کوئی مسافر، جہاز یا مال و اسباب نہیں گزر سکتا چیف کمشنر صدر مقام روس میں رہتا ہے اور اس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ماہوار ہے۔ یہ جزیرہ جنوبی و شمالی دونوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی ضلع کا صدر مقام ابرٹون ہے اور شمالی ضلع کا پاٹم۔ دونوں ضلعداروں کے ماتحت دوسرے بہت سے اسٹنٹ اور کمشنر کام کرتے ہیں۔ ۱۸۵۸ء کی ابتداء سے لے کر اب تک اس سٹیٹ کے دستور العمل اور قواعد میں بے شمار دفعہ تبدیلی ہوئی ہے اور ہر شہید زیادہ سے زیادہ سختی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کیفیت یہ ہے کہ

ہر کہ آمد براں مزید کرد

قیدیوں کے لیے قوانین | ہر سال دو ہزار کے قریب قیدی ہندوستان سے قید کر کے یہاں بھیجے جاتے ہیں، اس وقت یہاں چوڑے ہزار کے قریب قیدی موجود ہیں۔ جہاز سے اتر کر جب ایک ہینڈ ہو جاتا ہے تو ان کی بیڑیاں کا دی جاتی ہیں۔ یہاں جیل خانے نہیں بنائے گئے بلکہ قیدیوں کو بارکوں میں قیدی افسروں کے ماتحت رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان کی جیلوں کی طرح یہاں بھی قیدیوں سے دن بھر سخت مشقت لی جاتی ہے، دو وقت کھانا دیا جاتا ہے اور رات کو بارکوں میں ہی سلا یا جاتا ہے۔ بارکوں کی حفاظت کے لیے قیدی افسروں کے علاوہ اور کوئی پولیس یا جنگی پلٹن نہیں ہوتی الغرض قیدیوں کی حفاظت

نگرانی اور تقسیم کار وغیرہ سب قیدی افسروں کے سپرد ہے، جو سر پر لال دوپٹہ اور گلے میں چڑا اس ڈال کر رہتے تھے اور اپنے اپنے مارچ کے مطابق حکومت سے تنخواہ بھی وصول کرتے ہیں۔

نئے قیدیوں کو بھی بشرط ایک مہینی تین چار برس کے بعد تنخواہ ملنے لگتی ہے۔ تنخواہ پانے کے بعد یہ قیدی بھی پٹے والے افسر مقرر ہو جاتے ہیں۔ دس برس نیک چلن رہنے کے بعد ہر قیدی ٹکٹ کا مستحق ہو جاتا ہے ٹکٹ پانے والا قیدی بارک سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسے اجازت ہوتی ہے کہ جس شہر یا بستی میں چاہے سکونت اختیار کرے اور جو چاہے کسب معاش کا طریقہ اختیار کر کے کمائے اور کھائے۔

قیدیوں کی پچاس ساٹھ کے قریب بستیاں بھی موجود ہیں، ان میں نمبردار، بیٹواری اور چوکیدار سب قیدی ہیں۔ جو قیدی کھیتی باڑی کرنا چاہیں انہیں گاؤں میں سرکار کی طرف سے پندرہ بیگے زمین مفت مل جاتی ہے، تین برس تک محصول بھی معاف رہتا ہے بلکہ کبھی کبھی حکومت نقدی، بیل اور خوراک کی صورت میں بھی مدد کرتی رہتی ہے۔ جو لوگ مولائی، نانابائی یا نائی وغیرہ کے طور پر کام کرنے کے لیے ٹکٹ حاصل کرتے ہیں، انہیں کبھی کبھی حکومت کی طرف سے لہذا مل جاتی ہے۔ اس قسم کے ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد قیدی آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔

قیدی عورتیں ایک الگ جزیرہ میں لیڈی افسروں کے ماتحت بارکوں میں رکھی جاتی ہیں۔ جب تک بازگ میں رہتی ہیں، زنا کاری کی پوری پوری روک تھام کی جاتی ہے۔ عورتوں کو بھی بارکوں میں پسائی اور سلاخی وغیرہ کی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ عورتوں کو پانچ سال بعد آزادی کا ٹکٹ ملے دیا جاتا ہے لیکن جوان عورتیں جب تک شادی نہ کر لیں، انہیں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد بھی بارک سے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

پانچ برس کی مدت گزرنے کے بعد عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جس مرد سے چاہے شادی کر لے لیکن مردوں میں سے صرف انہیں شادی کی اجازت حاصل ہوتی ہے جو ٹکٹ حاصل کر چکے ہوں۔ جو آدمی شادی کرنا چاہے وہ عورتوں کے جزیرہ میں جا کر کسی عورت کو پسند کر لیتا ہے

اور اسے کچھ دے دلا کر شادی پر راضی کر لیتا ہے اور جب دونوں راضی ہو جاتے ہیں، تو انہیں اپنی رضا مندی اور محبت و موافقت سے مل کر رہنے کا اقرار نامہ لکھ کر جیف کمشنر کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بیوی اپنے خاوند کے گھر چلی آتی ہے۔

ٹیکٹ والے قیدی ملک سے اپنے بیوی بچوں کو بھی بلا سکتے ہیں۔ جب کوئی قیدی بیس برس تک نیک چال چلن رہے تو اس کی رہائی بھی ہو جاتی ہے اور اسے اختیار ہوتا ہے، چاہے یہاں رہے، چاہے اپنے وطن مالوف چلا جائے۔ ٹیکٹ حاصل کر لینے والے قیدیوں کو اختیار ہوتا ہے کہ حلال کھانی سے خواہ لاکھوں روپیہ جمع کر لیں لیکن ٹیکٹ سے قبل اسے اپنے پاس رکھنے یا کسی دوسرے کے پاس جمع کرانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بارک کے ایام میں قیدی ایک سال یا تین مہینے بعد ایک خط اپنے گھر بھیج سکتے ہیں اور ایک خط اپنے وطن سے وصول کر سکتے ہیں، لیکن ٹیکٹ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ مہینہ میں ایک خط بھیج سکتے ہیں اور ایک خط وصول کر سکتے ہیں۔

مختلف زبانیں | پورٹ پلیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں چینی، برہمی، ملائی، سنگلی، جنگلی، نکو باری، کشمیری، پشتونی، ایرانی، عربی، حبشی، پارسی، پرتگیزی، امریکی، انگریز، ڈین اور فرنچ اور اسی طرح ہندوستان کے تمام ضلعوں اور شہروں کے مثلاً بھوٹیا، نیپالی، پنجابی، سندھی، گجراتی، اہل راج، آسامی، تہلی، بند بکھنڈی، اوریسا، تلنگی، مرہٹے کرناٹکی، مدراسی، ملیالم، گوند، بھیل، بنگالی، گول اور سنٹھال وغیرہ ہر قسم کے لوگ موجود ہیں جب یہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن بازار اور پکھریوں کی زبان بھی یہاں بھی ہندوستانی ہے۔ ہر ملک کا باشندہ یہاں آ کر خود بخود ہندوستانی زبان سیکھ جاتا ہے کیونکہ اس زبان کو بغیر میاں گزارا ممکن نہیں۔ میرے خیال میں روسے زمین پر اور کوئی ایسا خط نہ ہو گا جہاں اس قدر کثیر قومیں آباد ہوں۔ جہاں پالیسی کے قریب مختلف قوموں کے افراد رہ رہے ہیں۔ شان الہی سے یہاں ایک ایسا ربط اور جمع لگا رہتا ہے۔

کہ روئے زمین پر کسی دوسری جگہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جب کوئی بنگالی مرد اور مدرسی عورت یا بھوٹیا مرد اور پنجابی عورت علیٰ هذا القیاس دو مختلف قوموں سے تعلق رکھنے والا جوڑا شادی کرتا ہے تو خاوند اپنی بیوی اور بیوی اپنے خاوند کی زبان سے نا آشنا ہوتی ہے۔ تکرار اور لڑائی کے وقت جب وہ ایک دوسرے کو اپنی مادری زبان میں گالی دیتے ہیں اور فریفتہ ثانی کچھ نہیں سمجھتا، تو ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کسی تقریب شادی وغیرہ پر ملک ملک کی عورتیں جمع ہو کر اپنی اپنی بولی میں گاتی، اپنی وضع پر ناچتی کو دتی اور اپنے اپنے ملک کا لباس زیب تن کرتی ہیں، تو یہ منظر بھی دید کے قابل ہوتا ہے۔

مختلف اقوام اور ان کی معاشرت

یہاں قوم کی پابندی، جو ہندوستان کی پرانی بیماری ہے، ایک قلم متروک ہو گئی۔ مسلمان مرد خواہ کسی ذات کا ہو ہر مسلمان عورت سے بلا روک ٹوک شادی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی ہندو ہونا کافی ہے۔ ایک ذات کا ہونا ضروری نہیں۔ برہمنوں کے گھروں میں پامنیں اور جاٹوں کے گھروں میں برہمنیاں موجود ہیں۔

یہاں ٹھگ وہ ٹھگ ہیں اور چوروہ ہیں کہ آنکھوں کا کابل چرائیں۔ یہاں شبدہ باز بازیگر، بہرو پیے، بھنڈیلے، نقال، سچڑے، نٹ، طوائف، میراثی گویئے اور ہر فن کے نیکف بد موجود ہیں۔ نیک اور اچھے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی تخریر دایسا نہیں جس میں مولوی، پنڈت اور درویش موجود نہ ہوں۔

مدراسی اور بنگالی سونکھی مچلی بھی بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ اس سونکھی مچلی کو جس سے سڑے ہوئے چڑے کی سی بو آتی ہے، عمدہ سے عمدہ گوشت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں برہما و پمین کے لوگ پینی کھاتے ہیں۔ مچلیوں کو پیوں میں بھر کر مٹانے سے جب ان میں کیڑے پڑ جاتے ہیں تو ان کیڑوں اور سڑی مچلیوں کو کوٹ کر پینی بنائی جاتی ہے۔ اس میں ایسی بدبو ہوتی ہے کہ بول بول کے رٹ ایکسبل پر بھی اس کی بدبو برداشت نہیں کر سکتے مگر برہما و پمین

کے لوگ اسے برآمدہ کھانے پر گرم مصالحہ کے طور پر چھڑک کر کھاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جب انہیں پینی مل جائے تو سمجھتے ہیں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت مل گئی۔ طوائف کی عام دوکانیں گو یہاں نہیں لیکن اکثر عورتیں ایسی بے حیا اور فاحشہ ہیں کہ کسبیل کو بھی ان سے شرم آتی ہے۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ ہر کسی کو اپنی وضع، رسم، بولی، لباس اور خوراک پسند ہے۔ جنگلی اپنے جنگلی میں رہنے، ننگ دھڑنگ چلنے پھرنے اور کپڑے مٹوڑے کھانے کو ہماری قبا اور دوشتالوں اور زردہ و پلاؤ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے کھانوں سے ان کو کتے ہونے لگتی ہے، ہمارے کپڑے پنہنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے جیسے ہمیں بھنگار بننے سے۔ برما اور چین کے لوگ ہمارے گھی کے کپڑوں کو دیکھ کر ناک بند کر لیتے ہیں۔ ہمارے قیلے، تورے اور پلاؤ کے بھنگار سے عربوں کا دماغ پرانندہ ہو جاتا ہے۔ انگریز ہمارے صط کو نہیں سونگھ سکتے۔ الغرض بچپن سے زبان اور ناک جس چیز کی عادی ہو جاتی ہے، اسے صرف وہی پسند ہے۔

۹ نومبر ۱۸۸۲ء کو جب میں رختِ سفر باندھنے کو تھا تو میں نے ایک عام دعوت کر کے اپنے سب دوستوں کو اس میں مدعو کیا۔ دعوت

الوداعی ضیافت

نامہ کی پیشانی پر میں نے لکھا تھا کہ :-

”یہ خاکسار اٹھارہ برس کے قیام کے بعد اب بظاہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان جا رہا ہے۔ امید ہے آج میرے تمام کرم فرما جن کے اسلام گرامی درج ذیل ہیں، قدم رنج فرما کر خاکسار کے ساتھ آخری ماحضر تناول فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں گے۔“

جس کسی کو بھی یہ دعوت نامہ موصول ہوا، بلا تکلف چلا آیا۔ یہ دعوت میرے گھر پر میرے روانہ ہونے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے قبل از دوپہر ہوئی تھی۔ میری جدائی کی وجہ سے حاضرین میں سے ہر ایک کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ بہت سے احباب اس مجلس میں کچھ تقریر

بھی کرنا چاہتے تھے مگر وہ لفظ کہنے کے بعد ہر کسی کی ہچکی بندھ جاتی تھی۔ میں خود بھی ایک نصیحت آمیز لمبی چوڑی تقریر کرنا چاہتا تھا لیکن ایک لفظ ہی نہ کہہ سکا اور دل کے ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

اس دن اتفاق سے جمعہ المبارک تھا۔ تناؤ دل طعام اور مولانا لیاقت علی کے ساتھ آخری نماز جمعہ ادا کرنے

مولانا لیاقت علی الہ آبادی

کے بعد گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ میں لواحقین کے ساتھ سوار ہو کر روس چلا آیا۔ صدمہ ہمارے عورتیں مجھے روس تک الوداع کرنے میرے ساتھ آئیں۔ جب چار بجے شب بیوی بچوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہوا تو بے شمار خلعت خوشی اور رنج کے ہلے محلے جذبات کے ساتھ زار زار رو رہی تھی۔

اس وقت بیوی اور آٹھ بچے میرے ساتھ تھے اور آٹھ ہزار کے قریب میرے پاس جائیداد تھی۔ اس وقت میں اس کیفیت پر نہایت تعجب کا اظہار کر رہا تھا کہ جب ۱۸۶۷ء کو اسی گھاٹ پر جہاز سے اترنا تھا تو میں نے لنگوٹی باندھ رکھی تھی اور تنہا تھا اور اب جب کہ اس رنج اور محن کی جگہ سے جا رہا تھا تو بیوی، آٹھ بچے اور آٹھ ہزار روپے کی جائیداد میرے پاس تھی۔ قدرت الہی کی کرشمہ سازی ملاحظہ فرمائیے کہ حکام دنیا نے مجھے بے غاماں کر کے سخت سزا کے لیے یہاں بھیجا تھا مگر اس حاکم حقیقی نے جس کے قبضہ تصرف میں دنیا و مافیہا کا انتظام ہے دشمنوں کے ہاتھ سے میرے ساتھ کتنے اچھے سلوک کرائے۔

یہ جہاز جس پر سوار ہونے کے لیے میں تیار تھا۔ بالکل اسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ جہاز لنگر انداز ہوا تھا جس پر میں آیا تھا۔ اس دن صبح کے وقت جہاز سے اترنا تھا اور آج شام کو سوار ہو رہا تھا۔ میں نے اس جزیرہ میں زندگی کی اٹھارہ بہاریں بسر کیں لیکن آج یہ سب کچھ مجھے ایک خواب معلوم ہو رہا تھا اور چشم تصور سے یہاں محسوس ہو رہا تھا گویا آج ہی صبح جہاز سے اترنا تھا اور شام کو سوار ہو رہا ہوں۔

میں نے چلنے سے چند روز پہلے زاویرام کے سوا اپنی کل جائیداد و شرعی حصوں کے مطابق

اپنی دونوں فیلیوں پر تقسیم کر دی اور خود دولت دنیا سے سبکدوش ہو گیا۔ اب میری ذاتی جانیداً چند کتابوں اور چند چڑے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

ہندوستان کو روانگی

شام کے پانچ بجے کے قریب ہم نے ہمارا ٹی اگنیوٹ پر سوار ہو کر ایک جگہ ڈیرہ ڈال لیا۔ اس جہاز پر ہمارے

علاوہ اور بھی بہت سے راہی حاصل کرنے والے مرد عورتیں، یورپین اور ہندوستانی مسافر بھی سوار تھے۔ موسم نہایت خوشگوار اور مسند پر سکون تھا۔ موہیں تھیں اور نہ تھلاطم۔ اس دن محرم کی دس تاریخ تھی، چودھویں صدی شروع ہو گئی تھی۔ غروب آفتاب کے وقت جہاز نے لنگر اٹھایا اور چیم پر آب کے ساتھ ہم نے جزائر انڈمان کو خیر باد کہہ کر پیچھے پھوٹنا شروع کر دیا۔ اب رات شروع ہو گئی تھی۔ چاندنی رات میں سمندر کی لہروں کا نظارہ بڑا فرحت بخش تھا۔ دوسرے دن جہاز جزیرہ کوک میں پہنچ گیا۔ دو دن بعد کچھ بارش بھی ہوئی، جس سے مسافر بھی کو قدرے تکلیف کا سامنا کرنا پڑا، مگر جب جہاز تھوڑا سا اور آگے چلا گیا تو بارش ختم ہو گئی اور تکلیف رفع ہو گئی۔

علی رضانا می ایک مشہور تاجر نے جہاز پر ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ دونوں وقت عمدہ کھانا، گوشت، مچھلی، چائے، کافی، برف، ہر قسم کے پھل اور میٹھائیاں ہمارے لیے لاتا۔ الغرض یہ سفر بڑے ہی راحت و آرام کے ساتھ طے ہوا۔

جب بارش کی وجہ سے سب مسافر تتر بتر کانپ رہے تھے، اس وقت راہی پا کر جانے والے مسافر نور الدین کی عورت کو دردِ ذہن شروع ہوا۔ اس حالت میں کہ نہ چوپانی کانپ رہی تھی، اس کے ہاں پلوٹھے بچے نے جنم لیا اور اس دن تو بے چاری کو مشکل سے دال بجات ملا ہو گا مگر اسے یا اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ ہوئی بلکہ دونوں صحیح سالم اور تندرست تھے۔

کلکتہ

جب جہاز کلکتہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اس نومولود بچے کی عمر صرف دو دن ہوئی۔

اس کی والدہ بچے سمیت دمنائی ہوئی جہاز سے اُتری اور پھر اس کے خاوند نے گلگت سے لاہور کا ٹکٹ لیا اور زچہ و بچہ خوش و غرم لاہور روانہ ہو گئے۔ سمندر میں جنم لینے کی وجہ سے بچے کا نام بھی سمندر ہی رکھا گیا۔

چار دن اور چار رات کے سفر کے بعد اللہ کے فضل سے ہم ۱۳ نومبر ۱۸۸۳ء (۱۴ محرم ۱۳۰۱ھ) کو گلگت پہنچ گئے تھے۔ وہاں چنیا پاڑہ میں مولانا عبدالرحیم صاحب کے برادر مولانا عبدالرؤف صاحب کے گھر رہے۔ وہاں سے تیسری رات ۹ بجے ریل پر سوار ہوئے اور گلگت سے الہ آباد، کانپور، علی گڑھ اور سہانپور کا منزل بہ منزل ٹکٹ لیتے ہوئے ۲۱ نومبر ۱۸۸۳ء کو بوقت ۹ بجے شب انبالہ کے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔

گلگت سے دوپاہی اور ایک نامک ہمارے اہل و عیال اور مال کی حفاظت کے لیے بطور اردلی انبالہ تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔

انبالہ

انڈیا میں چونکہ سارا سال موسم معتدل رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے پہلے کبھی گرمی سردی کو نہ دیکھا تھا۔ ہم چونکہ نومبر کے آخر میں گلگت میں آئے تھے اس لیے سردی سے انہیں قدرے تکلیف بھی ہوئی لیکن پھر آہستہ آہستہ عادی ہو گئے۔

ہر موسم میں جبہ کاپانی اور طرح طرح کے پھل کھانے کی وجہ سے میرے بیوی بچوں کی طبیعت نہایت شادال و فرحان تھی۔ پورٹ بلیر سے انبالہ تک کا سفر نہایت خوشگوار رہا۔ ہر دن عید اور رات شب بڑا کی کیفیت رہی۔

ایک دن وہ تھا کہ ہم ۲۲ فروری ۱۸۹۵ء کو انبالہ جیل سے زیور آہنی جو گیانہ لباس اور گیم پیادے آراستہ و پیراستہ ہو کر انبالہ پولیس کے زیر حراست مغرب کو روانہ ہوئے تھے اور بڑے آرام و مصائب کا توتہ مشق بتے ہوئے گیارہ ماہ میں انبالہ سے کالا پانی پہنچے تھے اور ایک دن یہ ہے کہ ہم بڑے آرام و آسائش کے ساتھ دریائی سفر طے کر کے گلگت پہنچے اور وہاں سے ریل کے سپیشل درجہ میں بلا شرکت غیرے اپنے ہی دس افراد پر

مشتل خاندان کو لے کر انبالہ آئے۔ نقد و جنس اور عمدہ لباس کو دیکھ کر حیران و نابالہ معلوم ہوتے تھے۔ پورٹ بلیہ سے ٹھیک گیارہ دن بعد انبالہ پہنچ گئے۔ میری اس کیفیت، شان، اولاد اور مال و منال کو دیکھ کر لوگ تعجب کا اظہار کرتے تھے۔ دوست خوش تھے اور دشمن ناخوش۔ راستہ میں جہاں بھی اُترتا تو ہر شہر کے مسلمان میرا نام سن کر میری ملاقات کے لیے دیوانہ وار دوڑتے چلے آتے تھے اور میری کیفیت دیکھ کر کہتے تھے کہ اللہ جل جلالہ بڑا قادر ہے، وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ جو بھی میری حالت سے واقف تھا وہ کہتا تھا کہ تمہارا اس ملک میں اس شان آنا، مردے کے زندہ ہونے سے کم نہیں، جو اس کرامت کو دیکھ کر ایمان نہ لائے وہ دل اور آنکھوں دونوں کا اندھا ہے ذرا غور فرمائیے یہاں مجھ سے ایک بیوی چھوٹی تھی، کالا پانی میں دو بیویاں عنایت ہوئیں۔ یہاں دو بچے چھوٹے تھے وہاں آٹھ مرحمت ہوئے۔ اسی طرح مال و اسباب اور نقد و جنس ہر ایک کا اللہ تعالیٰ نے مجھے نعم البدل عنایت فرمایا، جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:

وَأَيُّهَا أَهْلَهُ وَمِثْلَهُ مَعَهُمْ

رَحْمَةً مِنَّا وَذِكْرًا لِّ

لِلْعَابِدِينَ ۝

یہ آیت میرے اوپر بھی من و عن صادق آتی ہے مگر میرے اس قصہ سے جو آیات الہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے، صرف عابدین و صالحین ہی کو عبرت و نصیحت ہو سکتی ہے، منکرین و منافقین کو نہیں۔

دوسرے دن فجر کے وقت ہم انبالہ شہر پہنچے اور وہاں کے حکام سے **انبالہ** اجازت لے کر اپنے آقائے قدیم کپتان ٹیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب میں کپتان ٹیل کے منظر پر گیا تو وہ دوڑ کر میرے ملنے کے لیے باہر آئے

اور اندر لے جا کر مجھے موٹھے پر بٹھایا اور نہایت تسلی و تسفی کی اور فرمایا کہ آج سے بیس روپے ماہوار تنخواہ آپ کو اپنی جیب سے دیا کروں گا اور آپ کی ملازمت کے لیے بھی جلد ہی کوئی اچھا انتظام کروں گا۔

کپتان ٹیل کی کوشش سے بہت سے انگریز مجھ سے پڑھا کرتے تھے۔ میرے یہاں پہنچنے سے سو برس بعد تک کپتان نے پچاس روپیہ ماہوار کا میرے لیے انتظام کر دیا تھا۔ اپریل ۱۸۸۶ء کو جب وہ یہاں سے گئے تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا بلکہ پولیس نے میری نگرانی شروع کر دی اور مجھ پر سختی بھی بڑھادی گئی۔

انبالہ پہنچنے کے بعد جب میں نے اپنے اس بیس سالہ سفر کی ہندوستان کے نقشہ کی مدد سے پیمائش کی تو معلوم ہوا کہ انبالہ سے براستہ لاہور و بھٹی کالا پانی تک اور کالا پانی سے براستہ لکھنؤ انبالہ تک سات ہزار میل مسافت بنتی ہے اور اس سفر میں ہندوستان کے بعض شمالی اضلاع کو چھوڑ کر تقریباً پورے ملک کا طواف ہو گیا۔ انبالہ کے صدر بازار میں میں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور اہل و عیال سمیت اس میں سکونت اختیار کر لی۔

جب گھر کے لیے سب ضروری سامان خرید لیا تو ۱۱ دسمبر ۱۸۸۳ء کو ایک **دہلی** ہفتہ کی رخصت لے کر بذریعہ ریل دہلی گیا۔ وہاں ایک رات رہ کر دوسرے

دن بذریعہ یکہ پانی پت پہنچا۔ اتفاق کی بات ہے پورے بیس برس قبل جب میں پانی پت سے دہلی کی طرف بھاگ گیا تھا تو اس وقت بھی دسمبر کی تیر ۱۳ تاریخ تھی اور آج جب بیس برس بعد واپس آیا تو دسمبر کی تیر ۱۳ تاریخ ہی تھی۔ وہی سڑک، وہی موسم اور وہی تاریخ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ میں آج صبح ہی بیوی بچوں کو چھوڑ کر دہلی گیا تھا اور آج ہی واپس آگیا ہوں

مغرب کی نماز کے بعد پانی پت میں اپنے گھر پہنچا۔ میری بیوی اور لڑکے **پانی پت** مجھے دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ فرار کے دن جو بچہ چند دن کا تھا اب بیس برس کا ہو چکا تھا۔ پانچ دن ٹھہرنے کے بعد براستہ کرنال تھانسیر چلا گیا اور ایک رات

اور چند گھنٹے تھانیس میں قیام کرنے کے بعد پھر انبالہ لوٹ آیا۔
جس جس شہر میں بھی یہ عاجز گیا، ہزاروں خلقت میری آمد کی خبر سُن کر میری ملاقات کے
لیے آتی تھی۔ تھانیس میں تو اس قدر اژدہا مِخلاتی ہو کر کہ میں اس رات سو بھی نہ سکا اور جگہ
کی تنگی کی وجہ سے بہت سے لوگ میری ملاقات سے محروم رہ گئے۔ انبالہ میں تو کئی مہینوں
تک دور دراز سے آنے والے لوگوں کا اتنا بندھا رہا۔ لوگ میرے منہ کو دیکھ کر خدا کی قدرت
پر تعجب کرتے تھے۔

۱۳ دسمبر ۱۸۷۳ء کو جب میں نے تھانیس سے قدم اٹھایا، اس پر زوال
تھانیس شروع ہو گیا۔ بیس سال میں آبادی ساتویں حصہ سے بھی بہت کم رہ گئی۔
مکانات منہدم ہو گئے، گلی کوچے مسدود ہو گئے اور انسانوں کے بجائے بندروں نے کھنڈرا
کو اپنا مسکن بنانا شروع کر دیا لیکن خدا تعالیٰ نے قرائن سے مجھے معلوم کر دیا کہ یہ شہر پھر دوبارہ
نہایت دھوم دھام سے آباد ہو گا۔

تھانیس میں میں نے اپنے مولد و مسکن پر جا کر مالک مکان سے جو اس وقت اس میں
آباد تھا، منت سماجت کر کے یہ اجازت چاہی کہ مستورات کو کسی ایک کمرہ میں الگ کر دو
اور مجھے مکان کے اندرونی قطعات کی زیارت کر لینے دو۔ مالک مکان نے مجھے پہچان لیا،
نہایت اخلاق سے پیش آیا اور اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس جگہ
بھی مجھے قدرت الہی یاد آئی کہ جس مکان کو میں نے ہزاروں روپے صرف کر کے تعمیر کیا تھا
اس میں اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ وہ اس مکان
کو قبول کر کے اس کے بجائے مجھے آخرت میں مکانِ عنایت فرمائے گا۔ اب اللہ تعالیٰ
کے چند انعامات کا تذکرہ کر کے اس بیس سالہ سرگذشت کو ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ تاریخِ قید سے لے کر
انعامات الہی آج تک میں جہاں اور جس جگہ رہا اس نے مجھے اپنے سایہ

عاطفت میں رکھا۔ بیس برس میں ایک دن مجھی مشقت کرنے کی فہرت نہ آنے دی۔ کالا پانی پینے سے پہلے ہی اس نے میری راحت کے سامان فراہم کر دیئے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک بڑا سرکاری عہدہ مل گیا۔ کالا پانی پینے سے فقط چار پانچ سال قبل ان جزائر کا آباد ہونا، پورٹ بلیر کے قیدیوں کے قوانین میں نرمی و آسانی، ہمارے پینے سے قبل جنگل کی صفائی اور مملکت امراض کا خاتمہ، بیس برس تک بڑے آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنا اور ایسی مایوس کنی بلکہ سے حکام بالا کے تعصب کے باوصف شان و شوکت اور مال و اولاد کے ساتھ صحیح و تندرست بلکہ پہلے سے بھی بہتر حالت میں واپس آنا یہ سب میرے مولائے مجھ پر انعامات نہیں تو اور کیا ہیں؟

ہندوستان واپس آنے کے بعد، آب و ہوا کی سخت تبدیلی کے باوصف میرے بچے تندرست ہیں۔ بلکہ یہاں آکر اللہ تعالیٰ نے مجھے دو اور بچے بھی عطا فرمائے حالانکہ دوسرے بچے کے بچے وہ کالا پانی سے آئے تھے یہاں آکر بہت کم بچے۔ اس علاقے میں جب بھی کوئی متعدیہ جن پیدا ہے، میرا گھر محفوظ رہتا ہے۔ میرے یہاں پینے کے بعد یہاں بارش و باران حجبی بھرت ہونے لگ گئی ہے اور غلہ بھی نہایت اڑاں ہو گیا ہے۔ جب بیس برس بعد میری رہائی ہوئی تو تقاضائے بشریت کے مطابق مجھے بھی یہ فکر و امن کیے تھا کہ ہندوستان جا کر کہاں رہوں گا اور کیا کروں گا۔ کیونکہ تھا نیس میں میرے مکانات اور اراضی وغیرہ کو حکومت نے بحق سرکار ضبط کر کے سیلام کر دیا تھا اور منسلح انبالہ کے حکام ہمارے وہی پڑانے رفیق تھے، جنہوں نے کالا پانی بھیجا تھا۔ اس تردد اور انتشار کے وقت میں اس فادر کریم اور مقرب القلوب نے کھانا شیل کے دل میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ وہ میری واپسی کے ابتداء میں جب کہ ہر انگیزہ میری صورت سے متغیر تھا، میری طرف سے بدلتوں بطور وکیل لڑتا رہا تو اس نے وہ غلہ وغیرہ کی طرف سے بھی مجھے فارغ البال کر دیا۔

ریاست ارنولی میں ملازمت | جب ٹپل صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر چلے گئے تو انہوں نے میری درخواست کے بغیر

خود بخود ریاست ارنولی میں میرے لیے معقول روزگار کا بندوبست کر دیا، جہاں میں اب تک بڑے آرام و آسائش کے ساتھ ملازمت کر رہا ہوں۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے محض غیبی طور پر میرے روزگار اور آسائش کے سامان غیر مسلموں کے ہاتھوں فراہم کرا دیئے حالانکہ بظاہر ان سے ہمدردی کی کوئی توقع نہ تھی۔

مکمل آزادی | ہندوستان واپس آنے کے بعد پولیس کی جو نگرانی متعین ہوئی تھی، وہ کپتان ٹپل نے اپنی ذمہ داری اور ضمانت سے موقوف کرا دی تھی۔

کپتان کی تبدیلی کے بعد بغیر کسی سفارش کے محض اللہ کے فضل سے ۶ فروری ۱۸۸۸ء کو سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے ٹپلی نمبر ۱۸۸ موصول ہوئی، جس میں ہر قسم کی پابندی اور نگرانی کے خاتمہ کا اعلان تھا حالانکہ میرے دیگر بچوں اصحاب سجن مولانا عبدالرحیم وغیرہ سے ابھی تک نگرانی موقوف نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب میں بالکل آزاد ہوں، جہاں چاہوں رہوں اور جو چاہے روزگار اختیار کروں۔ کاروبار کے سلسلہ میں ہمیشہ لاہور اور کلکتہ آتا جاتا رہتا ہوں۔ ریاست ارنولی کے مقدمہ کی پیروی کے لیے دلایت بھی جانا چاہتا ہوں اور ارادہ ہے کہ انشاء اللہ ڈاکٹر ہنٹر اور دیگر موافق و مخالف انگریزوں سے ملاقات کر کے اس قدر ربّ الہی کا ان سے اعتراف کراؤں گا۔

جب میں انبالہ پٹجری کے اس مقام کو دیکھتا ہوں، جہاں مجھے پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا یا جب انبالہ جیل کے پاس سے نکلتا ہوں، جہاں ڈیڑھ برس تک پس دیوار زندان پابند زنجیر و سلاسل رہا، یا ان سڑکوں پر گزرتا ہوں، پھانسی کا حکم سنانے کے بعد جس سے چوتھے ہوئے جیل خانہ لے گئے تھے، تو قدرت الہی کو دیکھ کر میرا دل ہل جاتا ہے اور خیال کرتا ہوں

کے جس دن مجھے پچاسی کا حکم سنایا گیا، کسے گمان تھا کہ کبھی میں ان مقامات اور مشرکوں پر رہے روک ٹوک چل سکوں گا۔ ہرگز ہرگز نہیں کیسی فرد بشر کو بھی یہ گمان نہ تھا۔

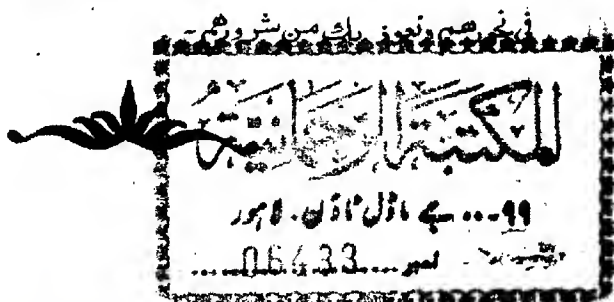
یہ فقط اس رب قدیر کا کام ہے کہ اس نے زمانے کے یہ سب گرم و سرد تماشے دکھا کر پھر اپنے نالائق اور مغرور غلام کو اس ملک میں دوبارہ آباد کر دیا ہے اور پہلے کی نسبت وہ چند لوگوں کی آنکھوں میں معزز اور ممتاز بنا دیا ہے۔ - وَذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔

اس قصہ کو محض ایک کہانی یا ایک فوجداری مقدمہ کا ترجمہ ہی نہ سمجھو بلکہ قصہ خاتمہ | تو آیات الہی میں سے ایک بڑی روشن آیت ہے۔ خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں ایسے ہی قصوں کے متعلق فرماتے ہیں :-

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ - ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔

اور یہ میں نے زیب داستان کے لیے شبیرِ قلم نہیں کیا بلکہ ارشادِ خداوندی :-
وَمَا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ - اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا بیان کرتے رہنا کی تعمیل ہے۔

میں نے اللہ رب العالمین جل جلالہ و عظم نوالہ کے جملہ انعامات ظاہری و باطنی کو ہمت اختصار کے ساتھ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب آخر میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محنت و مشقت اور تکالیفِ قید کو ریا سے پاک کر کے قبول فرمائے اور قارئینِ کم ام کو اس قصہ سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ - اللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ



محرم الحرام

ایک مظلوم اور بدنام مصلح !

ایک وقت تھا کہ

مسلمانوں نے دشت و جبل، بحر و بر اور دنیا کے گوشے گوشے کو مطلع انوار بنادیا تھا۔ لیکن بارہویں صدی میں

ایک ایسا دور بھی آیا کہ دنیا کو منور کرنے والے خود ماند پڑ گئے۔ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، کتاب و سنت کے دامن کو چھوڑ بیٹھے۔ اور دنیا پر پھر تاریکی کا سناٹا چھا گیا، ستم بالائے ستم !

سرزمین حجاز

- کی بھی یہ کیفیت ہو گئی، جہاں سے نور کے سوتے پھوٹے تھے، تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ :-
- مسلمانوں کی عظمت و فخر کی واپسی کیلئے کون میدان کارزار میں سریر کفن باندھ کر اُترا ؟
- کس نے سرزمین حجاز کے لوگوں کی زندگی، عقائد اور اخلاق میں غیر معمولی انقلاب برپا کر دیا ؟
- کس نے صدیوں کی تاریکیوں اور گمراہیوں میں حق کے سپراخ روشن کیے ؟
- کس نے سعودی خاندان کو جہان نبائی کے گرسہ کھاتے ؟
- وہ کون شخصیت تھی جس کی بزرگوار علم و فضل کے دبستان کلمے، اور ان میں قال اللہ و قال الرسول کی مدائج گونج اُٹھیں ؟

کے گہر بارگاہِ مسمیٰ

یہ ایمان پرورد و استن حیرت رقم کی ہے: محمد بن عبدالوہب
اسطالعہ نیچے اور دل کی دنیا آباد کیجئے !

سید عالم برحق

فیصل اکرمی فیصل آباد